OSMANIA UNIVERSITY

تاریخ ہند

جلد چہارم

برائے

انٹرمیڈیٹ

جامعہ عثمانیہ
OSMANIA UNIVERSITY

سلسلۂ نصاب تعلیم جامعۂ عثمانیہ

تاریخ ہند جلد چہارم

(برائے انٹرمیڈیٹ)

(طبع دوم)

تالیف

مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی

سابق رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

نظر ثانی طبع دوم

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔اے۔ایل ایل بی (عثمانیہ)

لکچرار کلیۂ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

۱۳۵۸ھ ۱۳۴۸ف ۱۹۳۹ء

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن
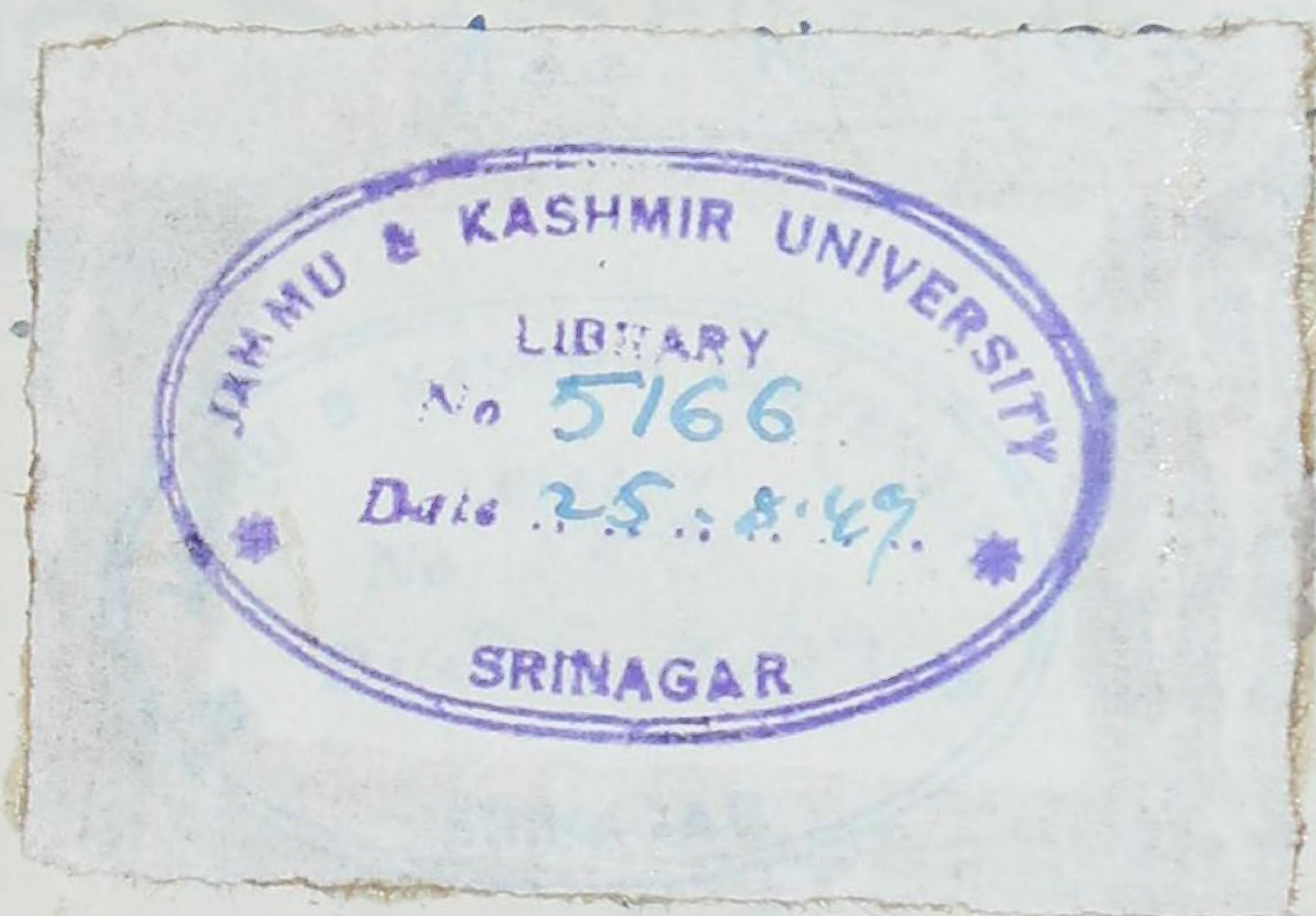
فہرست مضامین

تاریخ ہند جلد چہارم

(طبع دوم)

باب ۱

از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۵

باب ۲

سیادت ہند کا منصوبہ

از صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۵۶

باب ۳

مزید مقبوضات اور آغاز بادشاہی

از صفحہ ۵۷ تا صفحہ ۹۶

باب ۴

عہد شاہان برطانیہ

از صفحہ ۹۷ تا صفحہ ۱۲۰

باب ۵

جنگ کے بعد کا زمانہ

از صفحہ ۱۲۱ تا صفحہ ۱۳۰

باب ٦

تعلیم و تمدن و اصلاحات

از صفحہ ۱۳۱ تا صفحہ ۱۵۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ ہند

جلد چہارم

باب ۱

پہلی فصل :- بنگالے کی دیوانی -

یہ ہم پہلے پڑھ آئے ہیں کہ ۱۷۶۵ء میں کمپنی کو شاہ عالم کی طرف سے دیوانی بنگالہ کا فرمان عطا ہوا تھا اس فرمان سے ہندوستان میں سلطنت انگریزی کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے جس کے بعد ان پردیسی سوداگروں کا سیاسی اقتدار برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ آخر کار وہ ممالک ہند کے بلا شرکت غیرے مالک اور خود مختار حاکم بن گئے اگرچہ اس سے پہلے ۱۷۵۱ء والے محاصرۂ ارکاٹ سے کرناٹک اور بالواسطہ تمام دکن پر

باب ۱

ان کا اثر قائم ہو گیا تھا اور ادھر شمال میں ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر سے انگریز تمام مشرقی صوبوں کے مالک ہو گئے تھے لیکن اس میں کوئی قانونی جواز نہیں پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ عام لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کا تصرف کرناٹک اور ادھر قبضۂ بنگالہ جابرانہ ہے اور یہ جائز مالک نہیں ہو سکتے کیونکہ بالآخر تمام ہندوستان کے مالک شہنشاہ ہیں اور جب تک شہنشاہ خود اپنے فرمان کے ذریعے کسی طاقت کو کوئی چیز تفویض نہ کریں اس میں جواز نہیں پیدا ہو سکتا اور یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ گو شاہ عالم ثانی اور ان کے جانشین بالکل بے بس ہو کر رہ گئے تھے اور ان کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں تھا تاہم یہ اورنگ زیب کے جانشین تھے اور ان کی ذات کے ساتھ پرانی روایتیں وابستہ تھیں (عقیدہ) ہندوستان کی رعایا ان کو اسی طرح اپنا اوتار سمجھتی تھی جس طرح جہانگیر اور شاہجہاں کو سمجھتی تھی۔ ان کے فرمان کی تقریباً وہی وقعت تھی جیسے بڑے شہنشاہوں کی ہوتی تھی۔ انگریز کمپنی بھی اس کو خوب سمجھے ہوئے تھی اور یہی وجہ ہے کہ کلائیو نے شاہ عالم سے دیوانی بنگالہ کا فرمان حاصل کر لیا تاکہ اس سے کمپنی کا تصرف بنگالہ غاصبانہ سمجھا جائے بلکہ قانونی ہو جائے۔ اس فرمان میں بنگالے کے ساتھ دکن بھی شامل تھا یعنے کرناٹک کی صوبہ واری حکومت حیدرآباد سے خارج کر دی گئی اور شمالی سرکار کمپنی کو دیئے گئے۔ فرمان کے یہ اجزا انگریز کمپنی کے لئے بیحد ضروری تھے کیونکہ کرناٹک اس کے لئے ایک بڑی جولانگاہ تھی جہاں سے وہ پورے جنوب ہند پر قابض ہونا چاہتے تھے اور شمالی سرکار جو زرخیز ہونے کے علاوہ ساحلی تھے اور ان کی بحری اہمیت بھی تھی اس لئے ان کو فرانسیسیوں سے چھین کر خود اپنا نائب کر لیا تھا اور اس قبضے کو دربار حیدرآباد کے مقابلے میں جائز بنانا تھا۔ اور اس طرح شمال و جنوب دونوں جگہ کمپنی کا قبضہ اور تصرف قانونی شکل میں آگیا یعنے دوسرے الفاظ میں ۱۷۶۵ء سے جبکہ شاہ عالم کا فرمان نافذ ہوا تھا۔ انگریز حکومت کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں سے قرون وسطیٰ ختم ہو جاتے ہیں اور زمانہ حال شروع ہوتا ہے۔

چونکہ حصول دیوانی سے کمپنی بنگالے میں شہنشاہ کی نائب ہو گئی تھی اس پر کئی انتظامی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں اس کا نہ صرف یہ کام تھا کہ بنگالہ۔ بہار۔ اڑیسہ میں شہنشاہ کی طرف سے مالگزاری وصول کرے اور شہنشاہ کو ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ

ادا کرے بلکہ قانونی ذمہ داریاں بھی پوری کرے کیونکہ پرانے عملدرآمد کے مطابق دیوانی کے ساتھ قانون دیوانی کے اختیارات بھی شامل تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ کمپنی خود یہ فرائض ادا کرنے کے قابل نہ تھی۔ اول تو کمپنی کے پاس اتنے ذرائع نہ تھے کہ یہ تمام کاروبار خود انجام دے سکتی دوسرے کمپنی کے ارکان ہندوستان کے قاعدے اور قوانین سے اس قدر واقف نہ تھے۔ اس لئے لامحالہ کمپنی اس بات پر مجبور تھی کہ یہ کام ہندوستانی عہدہ داروں کے ہاتھ سے لے لے۔ چنانچہ بنگالے کے لئے محمد رضا خاں اور بہار کے لئے شتاب رائے مقرر کئے گئے۔ اول الذکر مرشدآباد میں اور آخر الذکر پٹنہ میں بیٹھ کر حصول مالگزاری کا کام کرتے تھے۔ لیکن بنگالے کی نظامت یعنے فوج اور کوتوالی کے اختیارات نواب نجم الدولہ کے ہاتھ میں تھے جو کمسن لڑکا تھا۔ اس کی نیابت بھی محمد رضا خاں کو دی گئی جو ۱۷۷۲ء تک دیوانی کے ساتھ نظامت کا کام بھی کرتا رہا۔ اس طریقے سے بنگالے کے تمام نظم و نسق ہندوستانی عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھا اور کمپنی اوپر سے ان کی نگرانی کرتی تھی۔ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دوعملی ہندوستان کے ان مشرقی صوبوں کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔ اگر کمپنی براہ راست یہ کام اپنے ذمے لے لیتی تو زیادہ ذمہ داری محسوس کرتی اور ملک کو نقصان نہ پہنچتا لیکن اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ہندوستانی عہدہ دار جو کمپنی کے برائے نام زیر نگرانی تھے کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے تھے اول تو کلکتے سے یہ بہت دور تھے اور کمپنی کو ان پر گرفت کا بہت کم موقع تھا۔ یہ اپنی جیب بھرتے تھے اور کمپنی کے روزافزوں مطالبات کی بجاآوری کرتے تھے اور یہ رقمیں لاکھوں کی تعداد میں انگلستان جایا کرتی تھیں اور یہ ان کے علاوہ تھیں جو شہنشاہ کو دی جاتی تھیں۔ اور اس کا تمام بار کاشتکاروں پر پڑتا تھا کیونکہ زمیندار تمام مطالبات کاشتکاروں سے پورے کرتے تھے۔ کمپنی کے ملازم علحدہ جبر شانی کرتے تھے۔ نہ صرف مال تجارت من مانے قیمت پر خریدتے تھے بلکہ بغیر کروڑگیری ادا کئے ہوئے لے جاتے تھے۔ ان انگریز ملازمین کی بے محابا رشوت و زرکشی کے حالات اکثر انگریزی تاریخوں میں موجود ہیں بقول گبن کے الفاظ میں "انسان کے جبر و تشدد پر قہر الٰہی مستزاد ہوا" اور ۱۷۶۹ء میں بارش کی کمی سے ایک فصل بگڑ گئی۔ ہندوستان میں امساک باراں

باب ۱

کی وجہ سے پیداوار کا نہ ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ اس کا الزام حکومت کی بدنظمی کو دیا جا سکتا ہے۔ لیکن پہلے مزارعین بالعموم خوش حال اور اجناسِ خوردنی کے اتنے کافی ذخیرے ملک میں بھرے رہتے تھے کہ ایک دو فصلوں کی خرابی ایسی مہلک نہ ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے انگریز کمپنی کی مالی حکومت کے آغاز میں صرف ایک مرتبہ کی بارش نہ ہونے سے نہایت خوفناک قحط پڑ گیا (۱۷۷۰ء مطابق ۱۱۸۴ھ) سب سے زیادہ مصیبت (زرخیز و مرطوب ہونے کے باوجود) انھی صوبوں پر آئی جو چند سال سے انگریزی کمپنی کے زیرِ انتظام تھے چنانچہ انگریزی روایتوں کے بموجب اس ایک ہی قحط میں بنگالے کی ایک تہائی آبادی (یعنی ایک کروڑ نفوس) فاقہ کشی سے ہلاک ہو گئی اور اس خوفناک نقصان کی ایک ربع صدی میں بھی تلافی نہ ہو سکی بلکہ سالہا سال تک یہ آباد ملک ویران رہا[1]۔

دوسری فصل وارن ہیسٹنگز کا زمانہ

وارن ہیسٹنگز

اس قحط نے کمپنی کو بہت سی مالی مشکلات میں پھنسا دیا ناتجربہ کار ملازمین کی نااہلی اور بددیانتی سے پہلے ہی اس کے انتظامی معاملات میں سخت ابتری پیدا ہو گئی تھی جس کی اصلاح کے واسطے کمپنی کے نظماء نے کلائیو کو دوبارہ کھلنے کا گورنر بنا کر ہندوستان بھیجا تھا اور یہاں دو سال رہکر اس نے اُن خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی واپسی (۱۷۶۷ء مطابق ۱۱۸۰ھ) کے بعد پھر وہی بدنظمی رونما ہوئی اور ادھر قحط نے کمپنی کو اس قدر مفلس کر دیا کہ اسے بہت بڑی رقم حکومت انگلستان سے قرض لینی پڑی، اسی کے ساتھ نظمائے کمپنی نے بنگالے میں اپنا گورنر مسٹر وارن ہیسٹنگز کو مقرر کیا کہ جہاں تک ہو سکے مذکورۂ بالا خرابیوں کو دور کرے اور نالائق ملازمین کمپنی کو بلا رو رعایت سختی سے قواعد و ضوابط کا پابند بنائے۔ وارن ہیسٹنگز انگلستان کے ایک غریب و شریف

[1] چنانچہ اس قحط کے تقریباً بیس برس بعد لارڈ **کارنوالس** نے بنگالے کی نسبت لکھا تھا کہ یہ ملک آج کل درندوں کا مسکن اور غیر آباد جنگل رہ گیا ہے! (مذکورۂ بالا تحریر گلاوجز ۔ آوکسفورڈ ہسٹری (صفحہ ۴۸۰، ۵۰۰) اور گزیٹیر (جلد ثالث صفحہ ۴۸۵) کے بیانات پر مبنی ہے۔ نیز دیکھو مل کی تاریخ ہند جلد ثالث کین جلد اول صفحہ ۱۸۲ وغیرہ۔

خاندان کا آدمی تھا (پیدائش ۱۷۳۲ء) اور لڑکپن سے کمپنی کا ملازم ہو کر ہندوستان آگیا تھا۔ کچھ عرصے وہ کلکتے اور مدراس کی کونسلوں میں رکن رہا اور اپنے فرائض کو اس نے ہمیشہ ایسی قابلیت سے انجام دیا کہ ظہائے کمپنی کا یہ انتخاب بالکل مناسب و بجا تھا۔ یوں بھی اس کی گورنری کا زمانہ بہت سے اہم تاریخی واقعات کے باعث مشہور رہے اور کلائو[1] کی طرح انگریز مصنفین وارن ہیسٹنگز کو بھی انگریزوں کی سلطنت ہند کا "معمار" یا بانی قرار دیتے ہیں؛

مگر اپنے تقرر کے بعد ہیسٹنگز اول اول اندرونی انتظامات کی درستی میں مصروف رہا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے "دیوان بنگالہ" کی حیثیت سے مرشدآباد کی بجائے کلکتے کو اپنا مستقر بنا لیا تھا لیکن ادھر تو ہیسٹنگز نے سابق عہد و پیمان کے خلاف بنگالے کے نام نہاد "نواب" کا سالانہ وظیفہ گھٹا کر آدھا کر دیا اور ادھر اس عذر پر کہ شاہ عالم بادشاہ الہ آباد کی سکونت چھوڑ کر دہلی چلا گیا اور مرہٹوں کو اپنا معین و مددگار بنا رہا ہے۔ اس نے وہ ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنا بھی موقوف کر دیا جس کی شرط پر شاہ موصوف سے دیوانی بنگالہ کی سند حاصل کی گئی تھی؛ اسی طرح اُس نے کمپنی کے اور مصارف میں بھی تخفیف و کفایت شعاری سے کام لیا اور مالگزاری وصول کرنے کے طریقے میں بعض اصلاحیں کیں نیز دیوانی اور مال کے جھگڑے چکانے کے لئے اضلاع میں جابجا انگریزی عدالتیں قائم کر دیں۔ لیکن فوجداری مقدمات کا فیصلہ اور عام انتظامات ابھی تک نواب یا ناظم بنگالہ کے ہندوستانی عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھے اگرچہ انھیں میر جعفر

---

[1] ۔ کلائو جسے پلاسی کی "فتح" کے کچھ عرصے بعد لارڈ کا خطاب مل گیا تھا جب ہندوستان سے دوبارہ واپس گیا تو بہت سی پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے مخالفوں نے وہاں اس پر غبن، خیانت مجرمانہ وغیرہ سنگین جرائم کے الزام قائم کئے اور بہت دن تک پارلیمنٹ میں اس کا مقدمہ ہوتا رہا جس پر موافق و مخالف مصنفین اپنے اپنے طور پر نہایت مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں ان حالات کا لکھنا بالکل بے محل ہوگا۔ مختصر طور پر یہ لکھنا کافی ہے کہ پارلیمنٹ نے اس کو تمام الزامات سے بری کر دیا تھا لیکن پھر اسے طرح طرح کی تکلیف وہ بیماریوں نے آگھیرا اور اُن تکالیف کو کم کرنے کی غرض سے وہ افیون کا بہت زیادہ استعمال کرنے لگا جس سے طبیعت اور کبھی نڈھال رہنے لگی یہاں تک کہ ۱۷۷۴ء میں اس نے اپنے مکان واقع لندن (برکلے اسکوائر) میں خود اپنا گلا کاٹ ڈالا" (اوکس ہسٹری صفحہ ۴۰۵)؛

کے بعد سے درحقیقت انگریزوں ہی کا ملازم سمجھنا چاہیئے؛

تنظیم حکومت کی ابتدا۔

ادھر ہی ہیسٹنگز کی گورنری کا زمانہ ہے جس میں انگلستان کی حکومت کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے مالی اور انتظامی مسائل کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کے متعلق سب سے پہلا تنظیمی قانون ("قانون تنظیمی مجریہ ۱۷۷۳ء") پارلیمنٹ میں مرتب اور منظور ہوا جو ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت کی پہلی بنیاد ہے۔ اس قانون کے چند حصے ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں یعنی ایک تو وہ حصہ ہے جس میں نظمائے کمپنی کے انتخاب اور سرکار سے تعلقات و فرائض کی صراحت کی گئی ہے اور جس کی قابل ذکر شرائط یہ ہیں کہ آئندہ سے نظمائے کمپنی کا فرض ہوگا کہ اپنی آمد و خرچ کے گوشوارے اور تمام ضروری خط کتابت کی نقول مجلس وزرا کے سامنے پیش کرتے رہیں؛ لیکن خاص ہندوستان سے متعلق قانون کا وہ حصہ ہے جس کی رو سے کمپنی کے ایشیائی مقبوضات کو چار احاطوں یا "پریسی ڈنسیوں"[۱] میں تقسیم کیا اور ان میں صدر احاطہ بنگال (فورٹ ولیم کلکتہ) کو قرار دیا ہے۔ اسی کے حاکم اعلیٰ کو "گورنر جنرل" کا لقب دیا گیا کہ وہ اپنے علاقے کے اندرونی انتظامات کے علاوہ دوسرے احاطوں پر بھی نگرانی رکھے اور وہاں کے حکام (خاص خاص ناگہانی صورتوں کے سوا) اس کی رائے کے بغیر کوئی جنگ و صلح نہ کر سکیں؛ لیکن اس نگرانی اور انتظام کا حصہ گورنر جنرل کی ذاتی رائے پر نہ تھا بلکہ اس قانون کی رو سے گورنر جنرل ہر معاملے میں اپنی "کونسل" یا مجلس انتظامی کے چار اراکین کے مشورے کا محتاج تھا اور تمام معاملات اسی مجلس میں اراکین کی کثرت رائے کے بموجب طے پاتے تھے؛

نئے انتظامات کے ساتھ اسی قانون کی رو سے کلکتے میں ایک "عدالت عالیہ" بھی قائم کی گئی جس میں اول اول اراکین عدالت کے انتخاب و تقرر کا حق حکومت انگلستان کو دیا گیا تھا اور پہلا شخص جو میر مجلس مقرر ہوا وارن ہیسٹنگز کا ہم مکتب اور دوست سر الیجا امپے تھا؛ یہ لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان ملکی اور عدالتی عہدہ داروں کی

---

[۱] یعنی کلکتہ، مدراس، بمبئی اور بن کولن (جزیرہ سماٹرا) جسے بعد میں ولندیزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ اردو میں "پریسی ڈنسی" کا ترجمہ "احاطہ" کرتے ہیں لیکن یہ لفظ مفہوم اصلی سے بہت دور اور ناموزوں معلوم ہوتا ہے اور ہمارے ہاں غالباً اس کا بہتر مرادف "نظامت" یا "ولایت" ہوتا؛

بڑی بڑی قرار تنخواہیں مقرر کی گئی تھیں جنھیں بعد میں گھٹانا پڑا۔

اس عہد کی لڑائیاں:- (۱) جنگ روہیلہ

اس اثنا میں (قانون تنظیمی کے نافذ ہونے سے قبل) نواب وزیر اور والیٔ اودھ اور روہیلوں کا وہ جھگڑا شروع ہو گیا تھا جس میں انگریز بھی نواب وزیر کے حلیف بن کر شریک ہو گئے۔ دراصل شاہ عالم بادشاہ کے دہلی آنے کے بعد جب مرہٹوں کا رسوخ بڑھا تو انھوں نے روہیلہ رئیسوں کو نہ صرف دربار دہلی سے خارج کر دیا بلکہ خود ان کے علاقوں پر یورشیں کرنے لگے اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس موقع پر والیٔ اودھ اور ان پٹھان رئیسوں کو مصلحت یہی نظر آئی کہ اپنی گذشتہ رقابت و دشمنی کو بھلا کر مرہٹوں کے خلاف متحد ہو گئے (۱۱۸۵ھ ۱۷۷۲ء) اسی ضمن میں نواب نے انگریزی فوج سے بھی مدد لی۔ کہتے ہیں کہ روہیلوں نے والیٔ اودھ کو اپنی اعانت کے معاوضے میں چالیس لاکھ روپیہ دینے کا عہد کیا تھا لیکن جب مرہٹوں کا حملہ پسپا ہو گیا تو روہیلے اپنے اقرار سے پھر گئے اور والیٔ اودھ نے ان کے مقابلے کے لئے انگریزوں سے ایک نیا معاہدہ کیا (عہدنامۂ بنارس ۱۷۷۳ء مطابق ۱۱۸۷ھ) اس معاہدے کے مطابق سال آئندہ انگریزوں نے زر کثیر کے عوض میں ایک جیش (بریگیڈ) والیٔ اودھ کی مدد کو بھیجا اور اودھ کی فوجوں نے روہیلکھنڈ پر فوج کشی کی سب سے بڑی لڑائی میران کٹڑے (ضلع شاہجہاں پور) کے مقام پر ہوئی (۱۷۷۴ء) اور اسی میں روہیلوں کا نامور سردار حافظ رحمت خاں مارا گیا۔ والیٔ اودھ کو فتح ہوئی اور ریاست رامپور کے سوا روہیلکھنڈ کے قریب قریب تمام علاقے پر نواب وزیر والیٔ اودھ کا قبضہ ہو گیا۔

(۲) پہلی جنگ مرہٹہ

اسی زمانے میں بمبئی کے انگریزوں کو مرہٹوں کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا موقع اس طرح ملا کہ چوتھے پیشوا مادھو راؤ کی وفات (۱۱۸۶ھ ۱۷۷۲ء) کے چند روز بعد پونا میں بہت سے خانگی فساد پیدا ہو گئے اور انھی جھگڑوں میں ایک سال کے اندر پانچویں پیشوا نراین راؤ کی جان گئی (۱۷۷۳ء) وہ لاولد تھا اس لئے اب اس کا چچا رگھوناتھ راؤ یا رگھوبا پیشوا بنایا گیا لیکن تھوڑے ہی دن میں معلوم ہوا کہ نراین راؤ کی بیوہ گنگا بائی حاملہ ہے لہذا ایک جماعت نے رگھوبا کو پیشوا ماننے سے انکار کر دیا اور بچے کی ولادت اور جوان ہونے تک گنگا بائی کو بچے کی اتالیق و سرپرست

کی حیثیت سے اپنا حکمراں ماننے لگے۔ مگر اختیارات کی باگ نانا فرنویس[1] کے ہاتھ میں آگئی اور وہی گنگا بائی کے نام سے رفتہ رفتہ حکومت کا مختار کار بن گیا۔ گنگا بائی کے حاملہ ہونے اور بعد میں اس کے بیٹے کی ولادت کا جب اعلان ہوا تو رگھوبا ریاستِ حیدرآباد و میسور سے لڑنے گیا ہوا تھا اور اس نے ان سب خبروں کو غلط اور محض اپنے دشمنوں کا جعل سمجھا لیکن اتنی دیر میں کہ وہ میسور سے واپس پونا آئے، گنگا بائی کی نئی حکومت مضبوطی سے قائم ہو چکی تھی اور اکثر مرہٹہ سردار نرائن راؤ کے نوزائیدہ بچے مادھو راؤ نرائن کو خواہ وہ اصلی تھا یا جعلی پیشوا مان چکے تھے۔ لہٰذا رگھوبا اپنے مقصد میں ناکام رہا اور شمالی دکن کے علاقوں میں ہٹ گیا کہ از سرِ نو جنگی تیاریاں کرے۔

انھی تیاریوں کی ضمن میں رگھوبا کو بمبئی کے انگریزوں سے مدد لینے کا خیال آیا اور انھوں نے اس کے معاوضے میں سالسٹ اور بسین کی بندرگاہیں طلب کیں۔ بلکہ معاہدے کی تکمیل سے قبل ہی سالسٹ پر اچانک حملہ کر کے قابض ہو گئے (دسمبر ۱۷۷۴ء مطابق ۱۱۸۸ھ) یہ عہدنامہ اور جنگ کی ابتدا کلکتہ کونسل کے بغیر اجازت کی گئی تھی اور کلکتہ کونسل نے ادھر تو بمبئی کے حکام کو (جو نئے قانون کی رو سے ان کے ماتحت تھے) لڑائی سے روکنا چاہا اور ادھر اپنے ایلچی پونا بھیج کر وہاں کی حکومت سے مصالحت کر لی۔ (عہدنامہ پورندھر) لیکن اول تو بمبئی کی کونسل نے اس معاہدے کو نہ مانا دوسرے کچھ عرصے کے بعد خود ناظمانِ کمپنی نے بمبئی کے انگریزی حکام کی تائید کی اور آخر میں کلکتہ کونسل نے بھی اجازت دے دی کہ بمبئی کی کونسل مرہٹوں کے تنازعات میں جس طرح مناسب سمجھے کام کر سکتی ہے[2]۔

---

[1] نانا فرنویس کا اصلی نام بلاجی جنارادن ہے۔ وہ مرہٹوں کے اعلیٰ طبقے کا فرد تھا۔ ۱۱۷۷ھ ۱۷۶۴ء میں پیشوا کے وزرا میں داخل کیا گیا اور اپنی قابلیت سے بہت جلد حکومت پونا کا سب سے ذی اثر رکن بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ پونا کے خانگی جھگڑے بپا کرنے میں اس کی بھی شرکت تھی لیکن مجموعی طور پر وہ سچا محبِ وطن اور نہ صرف مرہٹوں میں بلکہ اپنے تمام معاصرین اہلِ ہند میں نہایت ممتاز و مدبّر گزرا ہے۔

[2] گرانٹ ڈف جلد دوم صفحہ ۵۶ و ۳۵۵۔ واضح رہے کہ وارن ہیسٹنگز اس معاملے میں اوّل سے بمبئی کونسل کا مؤید تھا۔ لیکن کلکتہ کونسل کے دیگر اراکین مرہٹوں سے لڑائی مول لینے کے

باب ۱

مرہٹہ سرداروں میں درحقیقت بلا کا نفاق پیدا ہو گیا تھا اور اسی لئے انگریزوں کی یہ امید بیجا نہ تھی کہ رگھوبا کے علاوہ اور کئی سرداران کے طرفدار ہو جائیں گے۔ ابتدا میں بمبئی سے جو فوجیں بڑھائی گئیں انکی اس اندرونی نااتفاقی کی وجہ سے کوئی قابل ذکر مزاحمت بھی نہ ہوئی اور وہ مختلف مقامات کو لیتی ہوئی پونا کے بالکل قریب (اٹھارہ میل پر) آپہنچیں۔ بلکہ گرانٹ ڈف کی تحریر سے پایا جاتا ہے کہ خود اس شہر پر ان کا قبضہ ہو جانا کچھ دشوار بات نہ تھی۔ بایں ہمہ انگریزی تاریخوں کی روایات کے بموجب انگریز افسر محض اس وہم سے کہ آئندہ سخت جنگ پیش آئے گی خوف زدہ ہو گئے اور اپنی بڑی توپیں ایک تالاب میں ڈبو کے پسپا ہونے لگے۔[۱]

عہد نامۂ "وڈگاؤں"

اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ اگر یہ پسپائی کسی شکست کا نتیجہ نہ تھی تو غالباً اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ انگریزوں کو خود مرہٹہ سرداروں کے مل جانے اور مدد دینے کی جو امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور ان کو سلامتی اسی میں نظر آئی کہ اُلٹے پاؤں واپس ہو جائیں۔ لیکن مرہٹے اگر ان کی پیشقدمی کے وقت چپ تھے تو پسپائی کے وقت خاموش نہ رہے اور چند ہی روز میں اپنے پیہم حملوں سے انھوں نے انگریزوں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر جن شرطوں سے انگریزی افواج کو صحیح سلامت واپس جانے کی اجازت ملی وہ "عہد نامۂ وڈگاؤں" کی صورت میں قلم بند کی گئیں اور انگریزوں نے رگھوبا کی مدد اور مرہٹوں کے جن شہروں پر قبضہ تھا سب سے ہاتھ اٹھا لیا (جنوری ۱۷۷۹ء مطابق ۱۱۹۳ھ)

واضح رہے کہ اس معاہدے کی تکمیل کے وقت بھی مہادوجی سندھیا اور نانا فرنویس کی باہمی رقابت نے مرہٹوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اگر انگریز بالکل ہی مغلوب و مجبور نہ ہو جاتے تو انھیں اس نااتفاقی سے فائدہ اٹھانے کی بہت گنجائش تھی۔ چنانچہ گو وہ اپنے دو انگریز عہدہ داروں کو بطور یرغمال مرہٹوں کے حوالے کر آئے تھے لیکن خطرے کے مقامات سے باہر آتے ہی انھوں نے عہد نامے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ خلاف تھے اور ان کی کثرت رائے نے ہیسٹنگز کو مجبور کر دیا تھا۔

[۱] ۔ گرانٹ ڈف۔ جلد دوم صفحہ ۳۷۰۔

باب ۱

کی شرائط بھلا دیں اور کلکتہ کونسل نے بھی اس عہد و پیمان کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ایک بڑی فوج روانہ کی کہ پچھلی شکست و ناکامی کا بدلہ لے۔

مشہور معرکے اور صلح۔

یہ فوج آئندہ تین سال تک مالوے گجرات اور دکن کے علاقوں میں مصروف کارزار رہی۔ بمبئی اور مدراس کی مقامی انگریزی افواج اس سے الگ تھیں اور بڑودہ کی مرہٹہ ریاست کا ایک مدعی (فتح سنگھ) انگریزوں کا حلیف و مددگار ہو گیا تھا جس کی مدد سے احمد آباد اور گجرات کے دیگر مقامات پر قبضہ کرنے میں آسانی ہوئی۔ گوالیار کے قلعے پر بھی ایک انگریزی دستے کے سپاہی رات کے وقت چھپ کر چڑھ گئے تھے اور گوہد کا رانا سندھیا کے خلاف ان کا مددگار ہو گیا تھا۔ لیکن سندھیا سے اصلی جنگ کچھ مدت بعد سرونج کی نواح میں ہوئی جہاں کرنل کاماک اور اس کی فوج کو سندھیا نے گھیر لیا اور یہ انگریز افسر بمشکل شب خون مار کے محاصرے سے نکل سکا۔

خاص حکومت پونا کے علاقوں میں انگریزی سپہ سالار گوڈرڈ نے بسین کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اسی شہر کے قریب رام چندر گنیش اور کرنل ہارٹلے کے کئی مقابلے ہوئے۔ فریقین کے فوجی سرداروں میں یہ دونوں بڑے من چلے اور کار دان سپہ سالار مانے جاتے تھے اور ان کے ماتحت سپاہیوں نے بھی بہادری کا حق ادا کر دیا لیکن ایک معرکے میں جب کہ مرہٹوں کی فتح بالکل قریب نظر آنے لگی تھی گنیش جھلک زخم کھا کے گرا اور اس کی موت نے سپاہیوں کی ہمت پست کر دی۔ اِدھر غالباً اسی حملے کی ناکامی کے بعد بسین کے مرہٹہ مدافعین مایوس ہو گئے اور یہ شہر تسخیر ہو گیا۔

ان شمالی علاقوں سے ایک حد تک اطمینان حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے پورے ساز و سامان سے پونا پر پیشقدمی اور کوکن کی پہاڑیوں کو عبور کرنے کا قصد کیا اور اسی کوشش میں جنرل گوڈرڈ کو وہ ناکامی ہوئی جسے مرہٹے تو اپنی بہت بڑی فتح بتاتے ہیں اور انگریز فقط ایک ناکامیاب حملے کے بعد "پسپائی" کہتے ہیں اگرچہ یہ انگریز مورخوں کو بھی اقرار ہے کہ اس پسپائی میں انگریزی سپاہ کو سخت نقصانات برداشت کرنے پڑے۔[۱]

---

[۱] یہ تمام حالات گرانٹ ڈف کی مفصل "تاریخ مرہٹہ" سے ماخوذ ہیں (جلد دوم باب سیزدہم) اور حال کی انگریزی تاریخوں سے بھی ان کا مقابلہ کر لیا گیا ہے (مثلاً دیکھو کیمبرج ہسٹری جلد اول باب نہم فصل سوم وغیرہ وغیرہ)۔

بہر حال یہ انگریزی حملہ ناکام رہا اور ادھر دکن کی چاروں بڑی ریاستیں انگریزوں کے خلاف متحد ہوگئیں ان میں سے نواب نظام الملک (آصف جاہ ثانی) اور مداجی بھونسلے کو تو انگریزوں نے مختلف تدابیر سے رضا مند کر لیا مگر حکومت میسور نے پونا والوں کا ساتھ نہ چھوڑا اور انھی کی ہمدردی میں انگریزوں کے ساتھ وہ جنگ چھیڑ دی جس کا حال آگے آتا ہے۔ (۱۷۸۰ء مطابق ۱۱۹۴ھ)

عہدنامۂ سالبائی (یا سلبی)

گوڈرڈ نے ایک مرتبہ اور پونا پر بڑھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن دوبارہ ناکامی ہوئی اور اول تو اس تین سال کی جنگ و جدال میں کمپنی کا خزانہ خالی ہوگیا اور دوسرے حیدر علی والی میسور کے پیہم حملوں کی ضربات نے مدراس کے انگریز حکام کو نہایت ہراساں کر دیا۔ لہٰذا وارن ہسٹنگز کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ جس طرح ممکن ہو مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی جائے؛ اس کی طرف سے صلح کی تحریک پہلے بھی ہوئی تھی لیکن حکومت پونا نے حیدر علی کی رائے کے بغیر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا اور سچ یہ ہے کہ اس موقع پر اگر مہادو جی سندھیا اپنی ذاتی اغراض کی خاطر حکومتِ پونا پر زور نہ ڈالتا تو وہ اپنی اسی حکمت عملی پر قائم رہتی مگر نانا فرنویس اپنی مرکزی حکومت کی اندرونی کمزوری سے واقف تھا اس لئے ناکارہ بھی ان شرائط صلح پر رضا مند ہوگیا جو حکومتِ پونا کی طرف سے سندھیا نے انگریزوں کے ساتھ طے کی تھیں۔ (عہدنامۂ سالبائی مرتبہ ۱۷۸۲ء مطابق ۱۱۹۶ھ)

اس معاہدے کی قابل ذکر شرطیں یہ تھیں کہ انگریز سالسٹ کے سوا مرہٹوں کے تمام شہروں سے جن پر قبضہ کر لیا تھا، دست بردار ہو گئے۔ حکومتِ پونا نے رگھوبا کا تین لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور انگریزوں کے حلیف فتح سنگھ (گائکواڑ) کو گجرات کا رئیس مان لیا؛ بہ الفاظ دیگر، جو صورت جنگ شروع ہونے سے پیشتر تھی بظاہر وہی بحال رہی۔ بلکہ انگریز کسی قدر خسارے میں رہے لیکن درحقیقت اس معاہدے نے دوستی کا پردہ ڈال کر مرہٹوں کو دیگر ممالکِ ہند سے الساب دخل کر دیا کہ آئندہ بیس برس تک انگریز اطمینان کے ساتھ میسور و کرناٹک نیز اودھ کے علاقوں پر قبضہ جماتے اور اپنی قوت بڑھاتے رہے اور مرہٹوں نے ان کی مزاحمت نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد جب دوبارہ انگریز مرہٹوں کے مقابلے میں اترے تو حکومتِ پونا کو اس غفلت یا "غیر جانب داری" کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور

باب ۱

وہ اپنے حریف کی اضافہ شدہ طاقت سے عہدہ برآ نہ ہو سکی ؛
مرہٹوں کی یہ صلح والیٔ میسور کے لیئے سب سے زیادہ مایوس کن اور مضر تھی۔

محاربات میسور

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس موقع پر اس نے مرہٹوں کی تحریک سے انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی تھی اگرچہ مخاصمت کے اور اسباب بھی موجود تھے۔ لیکن ان اسباب اور اس دوسری جنگ میسور کے حالات لکھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم اس جگہ پہلی جنگِ میسور کے واقعات بھی بیان کر دیں کہ انگریزوں اور حیدر علی کے باہمی تعلقات کے سمجھنے میں آسانی ہو:-

انگریزی تاریخوں سے یہ بات صاف نہیں معلوم ہوتی کہ پہلی جنگِ میسور کی اصلی وجوہ کیا تھیں۔ یہ سچ ہے کہ بنگال و کرناٹک میں انگریزوں کا فروغ دیکھکر ہندوستان خاص کر دکن کے رئیسوں کو ان سے عداوت پیدا ہوئی ہو گی لیکن آغاز جنگ کے وقتی اسباب کے متعلق ہماری معلومات بہت ناکافی اور مشتبہ ہے۔ بہر حال اتنا معلوم ہے کہ اول اول اس جنگ میں نواب نظام الملک نے بھی حیدر علی کی مدد کی اور ۱۷۶۷ء (اواخر ۱۷۶۸ء) میں لڑائی شروع ہو گئی۔

میسور کے انگریزی محاربات میں یہ بات خاص طور پر طالب علم کے ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ریاست میسور کے پاس بحری جنگ کا کوئی معقول ساز و سامان نہ تھا اور اس کے طویل مغربی ساحل پر جہازوں کے ذریعے بلا دقت فوج اتاری جا سکتی تھی۔ اس طرف سے حملہ کرنے کے لیئے انگریزوں کا مستقر بمبئی بالکل قریب تھا اور اسی طرح مشرق میں مدراس پہلے ہی ان کی حکومت و قوت کا مرکز بن گیا تھا جہاں سے میسور پر چڑھائی کرنے میں کچھ دشواری نہ تھی کیونکہ کرناٹک ان کے زیر اثر آ چکا تھا؛ خلاصہ یہ کہ میسور کا دونوں طرف سے انگریزوں کی زد میں ہونا ان کی بڑی جیت تھی ؛

اہم واقعات

چنانچہ میسور کی پہلی جنگ میں بھی اگرچہ بمبئی کی طرف سے کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا تاہم وہاں کے انگریز حکام نے منگلور وغیرہ مشرقی اضلاع میں بغاوت کرا دی جن پر قریبی زمانے میں حیدر علی کا قبضہ ہوا تھا؛ ادھر مشرق کی طرف سے کئی انگریزی فوجیں مختلف راستوں سے میسور کے علاقوں میں گھس گئیں اور انھوں نے ہر جانب سے بنگلور کی سمت بڑھنا شروع کیا؛ گوٹی (ضلع اننت پور) کا مشہور مرہٹہ رئیس مرار راؤ گھوڑ پڑے

نواب محمد علی کا ساتھ دے چکا تھا۔ بعض خانگی تنازعات کی وجہ سے اس کا اپنی صدر حکومت (پونا) سے تعلق برائے نام رہ گیا تھا اور اسی نیم خود مختاری کی وجہ سے اسے بذاتِ خود ایک بڑی فوج مہیا رکھنی پڑتی تھی۔ لہٰذا جب وہ بھی انگریزوں کا شریک ہوگیا تو ان کی قوت بہت بڑھ گئی اور چند ابتدائی کامیابیوں کے بعد وہ خاص سری رنگ پٹن فتح کرنے کے منصوبے سوچنے لگے؛ لیکن حیدر علی کی حیرت انگیز کاروائی اور دلیری نے تھوڑے ہی دن میں ان منصوبوں کو باطل کر دیا اور جس آسانی سے انگریزی فوجیں میسور میں بڑھی تھیں اسی تیزی سے پسپا ہونے لگیں حالانکہ درحقیقت اب تک حیدر علی صرف غنیم کی یورش روک رہا تھا، مگر اس کے بعد جب خود اس کے حملہ کرنے کی باری آئی تو گویا وہ انگریزوں پر برس پڑا اور اس شدت و سرعت سے جا بجا انگریزی فوجوں پر حملے کئے کہ انھیں بچ کر نکلنا دشوار ہوگیا۔

حیدر علی کی اس چیرہ دستی نے سنہ ۱۷۶۸ء (سنہ ۱۱۸۱ و ۸۲ھ) میں لڑائی کا رنگ بدل دیا۔ اب انگریزی فوجیں ہر طرف سے نقصان اٹھا اٹھا کے واپس ہو رہی تھیں اور ان کی دفاعی قوت اس قدر مضمحل ہوگئی تھی کہ جب حکومت مدراس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی تو حیدر علی نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خود مدراس آرہا ہوں تمھیں جو کچھ کہنا ہو وہیں کہنا! اور یہ فقط دھمکی نہ تھی بلکہ چند ہی مہینے میں حیدر علی نے جو کچھ کہا تھا کر دکھایا۔ ہندوستان کی جنگی تاریخ میں اس کی وہ یلغار مشہور ہے جس میں ایک دن کے اندر وہ ایک سو تیس میل طے کر کے مدراس کے سامنے آ پہنچا اور وہاں کے خوف زدہ انگریز حکام سے اپنی من مانی شرطیں تسلیم کرالیں ۱؎ (عہد نامۂ مدراس۔ مارچ سنہ ۱۷۶۹ء مطابق سنہ ۱۱۸۲ھ)

میسور کی دوسری جنگ

انھی شرطوں میں ایک یہ بھی تھی کہ اگر ایک فریق پر کوئی بیرونی حملہ ہوگا تو دوسرا فریق اس کی مدد کرے گا۔ مگر صلح کے بعد جب مرہٹوں نے میسور پر کئی حملے کئے

۱؎ انگریزی روایات کے بموجب ان لڑائیوں میں سب سے بڑا معرکہ اروڑ کے قریب ہوا تھا جہاں انگریزی سردار نکسن کو کامل شکست ہوئی اور اس کی فوج میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو مقتول یا زخمی نہ ہوا ہو (دیکھو "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" (رولرز آف انڈیا) صفحہ ۵۶۔)

اور حیدر علی کو بہت سی مشکلات و مصائب کا سامنا ہوا تو انگریزوں نے اس کی اعانت نہ کی۔ اس نقض عہد کا قریب قریب ہر انگریز مورخ نے اعتراف کیا اور اس کا "مدراس کونسل" کے انگریز ارکین پر الزام لگایا ہے لیکن میسور کے سابق چیف کمشنر مسٹر بوُرنگ جن کی کتاب "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" سے ہم نے یہ حالات لکھنے میں مدد لی ہے، صراحت کرتے ہیں کہ خود حیدر علی نے اپنی طرف سے ہمیشہ مذکورہ بالا معاہدے کی پابندی کی اور مرہٹوں نے کرناٹک کے علاقوں پر حملہ کرنے میں حیدر علی سے مدد مانگی تو اس نے انکار کر دیا۔ اور ان کے ارادوں کی انگریزوں کو (اپنا حلیف سمجھ کر) اطلاع دے دی[1]۔ مزید براں، وہ انگریزوں کی جانب سے ایسے منافیٔ عہد یا سردھری کا سلوک دیکھ کر بھی ان سے بگاڑنی نہ چاہتا تھا کہ اتنے میں اول تو انگریزوں نے فرانس کے ساتھ جنگ ۱۷۷۸ء کے دوران میں ماہی کی بندرگاہ پر حملہ کیا اور ادھر کچھ عرصے بعد نواب نظام الملک اور مرہٹوں نے والیٔ میسور پر زور ڈالا کہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف شریک جنگ ہو جائے۔

اس جگہ یہ وضاحت کر دینی چاہیئے کہ گو ماہی کا چھوٹا سا قصبہ فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا لیکن حیدر علی کے علاقے میں ہونے کی وجہ سے وہ اُسے اپنے زیر اثر سمجھتا تھا اور میسور کے جنگی ساز و سامان کی درآمد بھی زیادہ تر اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ نظر بریں حیدر علی نے پیش از پیش انگریزوں کو اطلاع دے دی تھی کہ اس مقام پر حملہ نہ کیا جائے اور مدراس کا گورنر مسٹر ٹامس بھی والیٔ میسور کے خلاف منشا یہ کارروائی کرنا نہ چاہتا تھا لیکن انگریزی فوج کے سپہ سالار نے مسٹر ٹامس کی رائے نہ چلنے دی اور ماہی پر بجری حملہ کر کے چند روز کے لئے قبضہ کر لیا حالانکہ وہاں ریاستِ میسور کا پھریرا لگا ہوا تھا اور میسوری سپاہی بھی حیدر علی کی طرف سے اس بستی کی حفاظت کے لئے بھیجے گئے تھے[2]۔

"آخر کار حیدر علی نے جنگ کا قصد کر لیا" اور نواب نظام الملک اور مرہٹوں کی طرف سے فتح کرناٹک کا جو کام اس کے سپرد کیا گیا تھا، اسے انجام دینے کی وسیع پیمانے پر

---

[1] دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۸۳

[2] یہ حالات بوُرنگ (صفحہ ۸۴) اور کسفورڈ ہسٹری (صفحہ ۵۴۴) اور کین (جلد اول صفحہ ۲۱) کے بیانات سے جمع کئے گئے ہیں۔

تیاریاں کیں[1] جولائی ۱۷۸۰ء (۱۱۹۴ھ) سے میسور کی دوسری جنگ شروع ہوگئی اور تقریباً چھ سال تک اس کی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان حالات کو تفصیلی طور پر لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ یہاں صرف چند اہم واقعاتِ جنگ بیان کرنے کافی ہوں گے کہ اس جنگ میں حملے کا آغاز حیدر علی کی طرف سے ہوا اور میسوری افواج کرناٹک کی سرحدی فوجوں کو شکست دیتی ہوئی کنجی ورم (کانچی) کے قریب تک بڑھ آئیں۔ اسی شہر کے جنوب میں فریقین کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں جن میں حیدر علی کو فتح ہوئی (ستمبر ۱۷۸۰ء مطابق ۱۱۹۴ھ) انگریز سپہ سالار (سر ہکٹر منرو) نقصان کثیر اٹھا کے مدراس چلا آیا اور حیدر علی نے کنجی ورم تک سارا شمالی کرناٹک تاراج و پامال کر دیا۔

سال آئندہ حیدر علی کے مقابلے میں انگریزی فوج کی سپہ سالاری سر آئر کوٹ کو تفویض کی گئی جو اس زمانے میں بہت لائق و کامیاب فوجی افسر مانا جاتا تھا اور بے شبہ اس نے گذشتہ ناکامیوں کی ایک حد تک تلافی کی اور پورٹو نوو پر حیدر علی کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، بایں ہمہ اس کی اور اس کے بیٹوں کی فوجیں کرناٹک پر چھائی ہوئی تھیں۔ اور اسی زمانے میں فرانسیسی بیڑا اور تھوڑی سی بری فوج بھی والئی میسور کی مدد کے لئے آ پہنچی تھی جس سے حیدر علی کو بڑی تقویت پہنچی اور اگرچہ حالاتِ جنگ کی روایتوں میں بہت سے اختلافات ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ امر مسلم ہے کہ اس دو تین سال ہی کے اندر مدراس میں انگریزوں کی سلامتی مخدوش نظر آنے لگی اور اگر حیدر علی کے دوسرے اتحادی، جنھوں نے اسے جنگ پر آمادہ کیا تھا، خود انگریزوں کے ساتھ صلح نہ کر لیں تو ان کا حیدر علی کے مقابلے میں ٹھہرنا دشوار ہو جاتا۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اول نواب نظام الملک اور ناگپور کا مرہٹہ رئیس جنگ سے علحدہ ہو گئے اور اس کے بعد سالبائی کے عہد نامے نے انگریزوں کو مرہٹوں کی طرف سے بھی بالکل مطمئن کر دیا اور ان کی ایک فوج بمبئی کی جانب سے میسور کے

[1] بورنگ کا بیان ہے کہ حیدر علی نے اس موقع پر اسی ہزار فوج مہیا کر لی تھی (صفحہ ۸۸) مگر اس شمار میں مولف نے بائیس ہزار چپراسی یا برقنداز (؟) بھی شامل کر لئے ہیں۔ فوج کی رسد رسانی کا نہایت عمدہ اہتمام کیا گیا تھا اور اس محکمے کا تمام انتظام حیدر علی کے معتمد علیہ دیوان پورنیا کے سپرد تھا۔

مغربی علاقوں پر حملہ آور ہوئی ۔ (۱۷۸۲ء)

اپنے ساتھیوں کی اس طرح علیحدگی پر بھی حیدر علی کی غیرت و شجاعت نے انگریزوں سے صلح کرنی گوارا نہ کی اور وہ اسی زور و شور سے تنہا لڑتا رہا۔ اس کے زبردست حملوں نے انگریزوں کو جس قدر پریشان و ہراساں کر دیا تھا اس کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انھی دنوں جب حیدر علی نے وفات پائی (۱۱۹۵ھ ۱۷۸۲ء) تو مدراس میں علانیہ خوشیاں منائی گئیں اور اب بھی انگریز مورخ اس واقعے کو اپنی قوم کی بہت بڑی خوش قسمتی بتاتے ہیں۔[1]

لیکن حیدر علی کی وفات سے اہل میسور کی جرأت و قوت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس کا جانشین فتح علی عرف ٹیپو سلطان انگریزوں سے عداوت اور ذاتی دلیری میں اپنے نامور باپ سے بھی بڑھا چڑھا نکلا۔ وہ باپ کی زندگی میں اپنی سپہ سالاری کے جوہر دکھا چکا تھا اور تنجور کے قریب ایک بڑی لڑائی میں اس نے نمایاں فتح حاصل کی تھی۔ حیدر علی کی علالت اور وفات کے قریب وہ اپنے مغربی اضلاع میں تھا کہ اس طرف سے انگریزی فوج نے جنرل میتھو کی سپہ سالاری میں جو حملہ کیا تھا اس کا سدباب کرے۔ یہیں اس کو باپ کی وفات کی اطلاع ملی جسے دیوان پورنیا اور کرشنا راؤ نے نئے سلطان کے لشکر گاہ میں پہنچنے تک ازرہ خیر خواہی مخفی رکھا۔ پھر اعلان تخت نشینی ہونے کے بعد وہ دوبارہ جنرل میتھو کے مقابلے میں بڑھا اور انگریزی لشکر کو اس خوبی سے گھیر کر شکست فاش دی کہ حملہ آوروں میں سے بہ مشکل کوئی بچ کر بھاگ سکا ہوگا ورنہ سب کے سب ہلاک یا قید ہو گئے۔ (جنگ حیدر نگر ۱۷۸۳ء) انگریزی فوج کا ایک حصہ منگلور کی حفاظت کے واسطے متعین تھا، اسے بھی ٹیپو سلطان نے بڑھ کر قلعے میں محصور کر لیا۔

میتھو کی ہزیمت کامل اور گرفتاری نے انگریزی حکومت کو بہت مایوس کر دیا۔

صلح نامۂ منگلور

اس میں شک نہیں کہ مرہٹوں سے صلح ہونے کے بعد وہ بہت بڑی فوج میسور کے خلاف جمع کر سکتے تھے بلکہ ونسنٹ اسمتھ کا بیان ہے کہ خود مرہٹوں کو انھوں نے اپنی

---

[1] مثلاً دیکھو اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۳۵۔

کمک کے لئے آمادہ کر لیا تھا[1] حالانکہ حکومت میسور نے اس جنگ میں مرہٹوں ہی کی تحریک سے شرکت کی تھی! بایں ہمہ شیر میسور کو قابو میں لانا کچھ آسان بات نہ تھی اور ان دکن کی لڑائیوں نے کمپنی کا خزانہ اس قدر خالی کر دیا تھا کہ ولایت سے برابر جنگ ختم کرنے کے تقاضے ہو رہے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے انھی مصارف کے لئے بنارس کے راجہ اور بیگمات اودھ سے زبردستی روپیہ وصول کرنے کی جو کوشش کی اس میں بھی اتنی کامیابی نہ ہوئی کہ کمپنی[2] کا اچھی طرح کام چل جاتا۔ لہٰذا مدراس کے انگریزی حکام نے سلطان میسور سے خود صلح کی درخواست کی اور ان شرائط پر کہ فریقین مفتوحہ مقامات اور جنگ کے قیدیوں کو چھوڑ دیں گے[3] میسور کی یہ دوسری جنگ ختم ہو گئی۔ (مارچ ۱۷۸۴ء مطابق ۱۱۹۸ھ)

تیسری فصل۔ کارنوالس اور جان شور

ہیسٹنگز کا استعفا

مذکورہ بالا لڑائیوں کے فوائد و اغراض کو نظمائے کمپنی خوب سمجھتے تھے۔ لیکن حکومت انگلستان اس قسم کی کوشش ملک گیری کے موافق نہ تھی اور پارلیمنٹ میں بھی بعض مشہور و ذی اثر مفکر وارن ہیسٹنگز کے خلاف شرافشانی کرتے رہتے تھے۔ اس مخالفت کا ہندوستان میں یہ اثر ظاہر ہوا کہ ماتحت حکام وارن ہیسٹنگز کا حکم ماننے میں تساہل و سرکشی کرنے لگے۔ آخر اس کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ ۱۷۸۵ء کے آغاز (۱۱۹۹ھ) میں اپنے عہدے سے استعفا دے کر ولایت چلا گیا۔

[1] ۔ اوکس بس۔ صفحہ ۴۶ ۵۔

[2] ۔ ان واقعات کو ہم اپنی پہلی تاریخ ہند (برائے میٹرک صفحات ۵۸۳ وغیرہ) میں کافی وضاحت سے بیان کر چکے ہیں یہاں زیادہ تفصیل سے لکھنا ناموزوں ہوگا۔

[3] ۔ اس صلح کو اکثر انگریز مورخ اپنی قوم کے حق میں باعث ننگ و عار بتاتے ہیں (مثلاً دیکھو اوکس بس صفحہ ۵۴۶ "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" صفحہ ۲۰۲ وغیرہ) حالانکہ شرائط صلح میں کوئی بات ایسی قابل عار نہیں نظر آتی۔ البتہ عجب نہیں کہ اس موقع پر سلطان میسور کا فاتحانہ طرز عمل نیز انگریز قیدیوں کی تذلیل انگریزوں کو ناگوار ہوئی ہو اور آئندہ میسور تک تمام ہند پر تسلط پانے کے بعد انھیں اپنی گزشتہ ناکامیاں قابل عار نظر آنے لگی ہوں۔

کلکتہ کونسل کے بعض اراکین اور نند کمار کے ساتھ وارن ہیسٹنگز کے جو مناقشے اور لڑائیاں ہندوستان میں ہوئیں ان کی تفصیل ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہے۔ ان مخالف اراکین میں (جنھوں نے کثرت تعداد کے زور سے کئی سال تک ہیسٹنگز کی گورنر جنرلی کو معطل بنائے رکھا) فلپ فرانسس سب سے پیش پیش تھا۔ اسی نے کلکتے کی عدالت میں ہیسٹنگز پر خیانت و رشوت ستانی کا مقدمہ چلایا اور ایک دولتمند مہاراجہ نند کمار سے ان الزامات کے ثبوت فراہم کرائے۔ لیکن اول تو ہیسٹنگز نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا دوسرے اسی زمانے میں نند کمار پر جعلسازی کا مقدمہ قائم ہوا اور اسے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ غرض ہندوستان میں تو یہ فساد رفع دفع ہو گیا مگر ولایت پہنچ کر فرانسس نے برک اور پِٹ جیسے جادو بیان مشاہیر کو ہیسٹنگز کا دشمن بنا دیا اور انھی کی تقریروں کا اثر تھا کہ استعفا دینے کے بعد بھی ہیسٹنگز پر انگلستان میں مقدمہ قائم ہوا اور "دارالامرا" میں سات برس تک اس کی سماعت و تحقیقات ہوتی رہی۔ آخر وہ تمام سنگین الزامات سے بری قرار دیا گیا اور اس کی باقی عمر (۱۸۱۸ء تک) اطمینان کے ساتھ بسر ہوئی اور اس نے آیندہ سیاسیات میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔

قانون ہندوستان مجریہ ۱۷۸۴ء

وارن ہیسٹنگز کے طرزِ عمل سے حکومت انگلستان کی ناخوشی کا ایک بدیہی ثبوت وہ "قانونِ ہندوستان" تھا، جس کی تجویز کو اس زمانے کے وزیراعظم پِٹ کے نام سے (پٹس انڈیا بل) موسوم کرتے ہیں۔ یہ ۱۷۸۴ء (۱۱۹۷ھ) میں نافذ ہوا اور اگرچہ اس نے کمپنی کے معاملات میں کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن ایک نئی مجلس نظارت (بورڈ آف کنٹرول) کے قیام سے کمپنی کے معاملات پر حکومت انگلستان کی نگرانی بڑھا دی کیونکہ اس مجلس کو کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے ملکی و مالی جنگی و عدالتی ہر قسم کے معاملات میں دخل دینے کا وسیع اختیار دیا گیا تھا اور اس کے احکام نظمائے کمپنی کی ایک مخصوص جماعت کے ذریعے نافذ اور واجب التعمیل قرار دیئے گئے تھے۔ نظما کی یہ جماعت "مجلس راز" (کمیٹی آف سک رسی) کہلاتی تھی۔ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی مجلس نظارت کا صدر نشین بعد میں وزیر ہند کے نام سے وزارت انگلستان کا رکن بنا لیا گیا اور اس کی کونسل میں ایک "مجلس راز" اب تک سابقہ نظام کی یادگار ہے۔

نئے قانون نے انگریزی عدالت اور گورنر جنرل کے انتظامی اختیارات کے متعلق بھی بعض مفید اصلاحیں کیں اور مدراس و بمبئی کے حکام پر اس کی نگرانی کو بڑھا دیا۔ نیز خاص خاص صورتوں میں گورنر جنرل کو اختیار دیا کہ وہ کونسل کے منشاء کے بغیر اپنی ذمہ داری پر کام کر سکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ جنگ و صلح کے اختیارات محدود اور اس بات کی صراحت کر دی گئی کہ کمپنی کے ماتحت حکام مجلس نظارت یا مجلس نظماء کی صریح اجازت کے بغیر ہندوستان میں کسی ریاست کے خلاف یا موافق کوئی جنگ نہ کر سکیں گے اور نہ اس قسم کے معاہدے کریں گے جن کی رو سے کمپنی کو شریک جنگ ہونا پڑے۔ اسی ضمن میں ملک گیری اور کشور کشائی کی ممانعت اور مخالفت پر بھی بہت زور دیا گیا۔ چنانچہ اس قسم کی کوشش بلکہ خواہش کو یہ قانون ان واضح الفاظ میں روکتا ہے کہ:-

"ہندوستان میں فتوحات اور اضافہ مقبوضات کے منصوبوں پر عمل کرنا ایسے
"کام ہیں جو اس قوم (یعنی اہل انگلستان) کی خواہش، راستبازی اور سیاسی
"اصولِ عمل کے سراسر منافی ہیں!" (ادکس ہیں صفحہ ۵۵۲)

لارڈ کارنوالس

یوں بھی نئے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کو ہندوستان آتے وقت مذکورۂ بالا اصول پر عمل کرنے کی تاکید کر دی گئی تھی اور وہ خود "عدم مداخلت" کا بڑا حامی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ میدانِ کارزار میں گزرا تھا اور اگرچہ امریکہ میں آخری شکست[1] اور قبولِ اطاعت کی وجہ سے اس کے سپاہیانہ جذبات دھیمے پڑ گئے تھے مگر چند سال آرام لینے کے بعد اسے ہندوستان میں پھر سیاسی ریشہ دوانی اور فتوحات کا شوق چرایا تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی کیونکہ درحقیقت خود اہل ہند کی اندرونی حالت اور نااتفاقی اس امر کی متقضی تھی کہ ایک بیرونی قوت ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے۔

---

[1] امریکہ کی "جنگ استحصال آزادی" میں سب سے آخر میں جس انگریزی فوج نے ہتھیار ڈال دیے تھے اس کا سپہ سالار کارنوالس ہی تھا (۱۷۸۱ء) اور اہل انگلستان کی یہی وہ شکست تھی جس نے لڑائی کا خاتمہ کر دیا اور اہل امریکہ آزاد ہو گئے۔

الغرض ۱۷۸۶ء کے اواخر (۱۲۰۱ھ) میں[1] لارڈ کارنوالس ہندوستان پہنچ گیا اور نظم و نسق کے قابو میں آنے اور گویا کچھ عرصہ دم لینے کے بعد اس نے بھی اسی قسم کی ریشہ دوانیاں شروع کردیں جنھیں بحوالۂ بالا قانون میں اس شد و مد سے روکا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ سلطان میسور کو انگریزوں سے غالباً طبعی منافرت تھی لیکن عہد نامۂ منگلور کے بعد سے اس نے کوئی کام ایسا نہیں کیا تھا کہ انگریزوں کو شکایت کا موقع ملتا۔ لہٰذا جب خود لارڈ کارنوالس نے نواب نظام الملک اور مرہٹوں کے ساتھ میسور کے خلاف درپردہ یہ قرارداد کرلی (۱۷۸۸ء) کہ میسور کے شمالی اضلاع پر قبضہ کرنے میں انگریز نواب موصوف کی مدد کریں گے تو یہ صلح نامہ منگلور کی صریح خلاف ورزی تھی[2] اس پر بھی ٹیپو سلطان غضب ناک ہوکر خاموش ہو رہا اور خود نواب نظام الملک کی طرف سے بھی لڑائی کی ابتدا نہیں ہوئی۔ لیکن جب اسی زمانے میں ٹراونکور کے راجہ نے میسور کی سرحد پر جنگی استحکامات کئے اور ولندیزوں نے دو قلعے خرید لئے جو حکومتِ میسور کے زیرِ اثر علاقے میں تھے تو سلطان میسور نے راجہ کو تنبیہ کی اور بعض باغی مجرمین کو حوالہ کردینے کا مطالبہ کیا جو میسور کے علاقے سے بھاگ کر ٹراونکور میں جا چھپے تھے۔ راجہ نے ان مراسلات کی کوئی پروانہ کی اور سلطان ٹیپو نے بگڑ کر اس پر فوج کشی کی اور اس کا مشرقی علاقہ تاراج و پامال کرڈالا[3] (۱۷۸۹ء مطابق ۱۲۰۴ھ)

لہ۔ کارنوالس کے آنے سے قبل تقریباً دو سال تک سرجان میک فرسن عنصرانہ گورنر جنرل رہا جس کی "دنائت" اور "بددیانتی" کی اکثر انگریز مورخوں اور خود کارنوالس نے سخت مذمت کی ہے (اوکس ہس صفحہ ۵۳، ۵۵ وغیرہ)

۲ہ۔ اس درپردہ سازباز پر انگریز مورخوں نے کارنوالس کی بہت تعریف کی ہے واضح رہے کہ قانون ۱۷۸۴ء کی رو سے وہ باضابطہ کوئی معاہدہ نواب نظام الملک کے ساتھ نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس نے مذکورۂ بالا قرارداد ایک خط کے ذریعے سے کی اور یہی وہ کارروائی تھی جسے گرانٹ ڈف "علانیہ معاہدۂ جنگ کرنے سے بھی زیادہ قابل اعتراض بتاتا ہے۔ جلد سوم صفحہ ۴۲۱ نیز دیکھو کین جلد اول ۲۳۰ اوکس ہس ۵۵۸۔

۳ہ۔ ٹراونکور سے لڑائی کے مذکورۂ بالا اسباب کے لئے دیکھو "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" باب ہفتم۔ مگر اس انگریز مولف نے ان حالات کو ایسے مخالفانہ پیرائے میں لکھا ہے کہ تمام الزام ٹیپو سلطان پر وارد ہو۔

ٹراونکور کا راجہ انگریزوں کا حلیف تھا۔ اس پر حملے کا ہونا کارنوالس کے لئے اعلان جنگ کرنے کا معقول عذر بن گیا۔ وہ جنوبی ہند کی اس آزاد اور خطرناک ریاست (میسور) کو کمزور یا پامال کرنے پر پہلے سے تلا بیٹھا تھا۔ اب اس بات کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ نواب نظام الملک یا مرہٹوں کو سامنے رکھ کر میسور سے پس پردہ جنگ کی جائے۔ دکن کی یہ دونوں حکومتیں سلطان میسور سے ناخوش ضرور تھیں۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر اس کا ملک فتح اور آپس میں تقسیم کر لینا بھی چاہتی تھیں۔ لیکن کارنوالس کی مذکورۂ بالا تحریک اور ہمت افزائی کے باوجود انھوں نے ابھی تک میسور پر حملہ نہیں کیا تھا اور خود ٹیپو سلطان اس بات پر بھی آمادہ تھا کہ ٹراونکور کے متعلق انگریزوں سے مصالحانہ گفتگو اور اپنے حملے کی وجوہ بیان کرے۔ مگر اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی[1] اور فروری ۱۷۹۰ء (۱۲۰۴ھ) میں جنگ کا اعلان ہو گیا۔

جنگ کے واقعات بیان کرنے میں انگریزی مورخوں نے صریح طرفداری سے کام لیا ہے اور شوکت نمائی کے لئے زیادہ تر انگریزی فتوحات ہی کا حال تحریر کیا ہے۔ لیکن انھی یک طرفہ روایتوں سے یہ امر ثابت ہے کہ پہلی مرتبہ جو فوجیں جنرل میڈوز کی ماتحتی میں بڑھائی گئی تھیں اور بنگلور و سری رنگ پٹن تک پہنچ گئی تھیں۔ انھیں جابجا شکستیں ہوئیں اور ہر طرف سے پسپا ہونا پڑا[2] حتیٰ کہ سال کے ختم پر خود لارڈ کارنوالس میدان میں پہنچ گیا اور مزید ساز و سامان کی فراہمی کے ساتھ اس نے نواب نظام الملک اور مرہٹوں کو تاکید بلیغ کی کہ جلد سے جلد اپنی پوری طاقت سے جنگ میں شریک ہوں۔ چنانچہ صرف مرہٹہ سپاہیوں کی تعداد جو پرسرام بھاؤ اور ہری پنت پھڑکے کے ماتحت میسور پر حملہ آور ہوئی کم سے کم بیس ہزار تھی[3] حیدرآباد کی فوج کا شمار اس سے بھی زیادہ تھا۔

---

[1] "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" ۱۴۳

[2] حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" باب ہشتم

[3] حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۵۹ اگر یہ کم سے کم اور غالباً غلط تخمینہ ہے۔ گرانٹ ڈف کی الجھی ہوئی تحریر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹہ سپاہیوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی (تاریخ مرہٹہ" جلد سوم باب سوم)

باب۲

اور بے شبہہ ریاست میسور کی یہ بساط نہ تھی کہ اس عظیم الشان لشکر کا مقابلہ کرتی جو تین طرف سے ملک پر حملہ آور ہوا تھا۔ لیکن ٹیپو سلطان اپنی شجاعت کی بدولت انگریزوں میں نیم دیوانہ سمجھا جاتا ہے اور اپنے ہم وطنوں میں "شیر میسور" کے لقب سے ملقب تھا۔ ان کثیر التعداد حملہ آوروں کا جو درحقیقت میسور کی آزاد حکومت و نموت کے دشمن تھے۔ اس نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا اور اس کے بہادر سپاہیوں اور سرداروں نے اتحادیوں کی ہمتیں پست کر کر دیں خود کارنوالس کو سری رنگ پٹن پہنچ کر پہلی مرتبہ خائف و ناکام پسپا بلکہ فرار ہونا پڑا[1] اور آخر میں جب اتحادیوں نے پوری طاقت اس شہر کے گرد جمع کر لی اس وقت بھی وہ "شیر میسور" کے پائے تخت کو تسخیر نہ کر سکے اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔

عہد نامہ سری رنگ پٹن

صلح کی جو شرطیں قرار پائی تھیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس فتح میں انگریز شریک غالب نہ تھے چنانچہ تنگ بھدرا ندی کے شمال کے تمام اضلاع نواب نظام الملک اور مرہٹوں کے حصے میں آئے جو بہت دن سے ان پر دعویٰ ملکیت رکھتے تھے ملیبار کا ساحلی حصہ اور مشرق میں ونڈگل اور بارہ محل کے بامو قع جنگی مقام انگریزوں کو ملے اور تاوان جنگ (تین کروڑ تیس لاکھ روپیہ) اتحادیوں میں بحصۂ مساوی تقسیم کر لیا گیا۔ لیکن جب والی میسور نے یہ شرطیں مان لیں اور اپنے دو بیٹے بطور یرغمال نیز کچھ روپیہ پیشگی محاصرین کے حوالے کر دیا تو کارنوالس نے عہد نامے میں ایک نئی شرط یہ بڑھا دی کہ کورگ بھی ریاست میسور سے لے کر انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا[2]۔ کارنوالس کی اس حرکت نے ٹیپو سلطان کو سخت برافروختہ کیا لیکن اس کے بیٹے دشمن کے لشکر میں پہنچ چکے تھے۔ غم و غصہ کھا کر خاموش ہو گیا اور معاہدے پر دستخط کر دیئے[2] (۱۷۹۲ء مطابق ۱۲۰۶ھ)

---

[1] دیکھو تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۵۶ اوکس ہس ۶۰، ۵۹، ۵۵ کین جلد اول صفحہ ۲۳۰۔

[2] اوکس ہس صفحہ ۶۰ "حیدر علی... سلطان" ۱۷ وغیرہ؛ ونسنٹ اسمتھ نے بھی اس ناجائز کارروائی کو ایک حد تک قابل اعتراض سمجھا ہے اور اس میں شبہہ نہیں کہ لارڈ کارنوالس کا جو کمپنی کے پہلے ملازمین کی طرح بے اصول آدمی نہ تھا ایسی حرکت کرنا بالکل خلاف توقع تھا۔ اسی ضمن میں

اس فتح کے بعد، جس کے صلے میں کارنوالس کو "مارکوئیس" بنایا گیا تھا، اس کا باقی وقت نظم ونسق کی اندرونی اصلاح میں صرف ہوا۔ اس نے عدالتوں کی از سر نو تنظیم اور ان کے اختیارات کی حدبندی کی۔ وہ ہندوستانیوں کی نسبت بہت بُری رائے رکھتا تھا اور ان کے ہاتھ سے تمام فوجداری اختیارات لے لینے چاہتا تھا۔ اس نے تنخواہوں میں بھی جو جدید اضافے کئے ان سے ہندوستانی ملازمین کو محروم کر دیا[1]۔ بایں ہمہ اس کے زمانے کا یہ کارنامہ یادگار ہے کہ بنگالے میں "دوامی بندوبست" جاری کیا جس نے اس صوبے کی گذشتہ پامالی کی بہت کچھ تلافی کر دی[2]۔

اس بندوبست کی رُو سے زرعی زمین پر ہمیشہ کے لئے سرکاری لگان کی ایک رقم معین کر دی گئی جس سے مالکان زمین کو زراعت میں ترقی دینے کی ترغیب وتحریص ہوئی اور ان کے صرف کثیر اور کوشش سے بہت سی افتادہ زمینیں مزروعہ ہو گئیں۔ ابتداء میں یہ کسر ضرور تھی کہ قانون میں مالکان زمین کی کاشتکاروں سے زیادہ ستانی کا کوئی تدارک نہیں کیا گیا تھا اور یہ نقص کچھ عرصے بعد دفع ہوا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں دوامی بندوبست "ملکی خوش حالی کی ضمانت ہے اور اس پر جو انگریز مصنف یا اہل الرائے اعتراض کرتے ہیں وہ ان کی نافہمی یا بے انصافی ہے۔ ہندوستان کے مشہور محبانِ وطن کی سالہا سال سے

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گذشتہ۔ یہ جتانا مناسب ہوگا کہ بعض انگریز مصنفوں نے شرائط صلح کو بہت نرم بتایا اور کارنوالس پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے ایسے دشمن سخت کو مغلوب کرنے کے بعد پھر سلامت کیوں رہنے دیا۔ لیکن دراصل ان معترضین کو یہ غلط فہمی خود اپنی غلط بیانیوں سے پیدا ہوئی ہے اور اگر وہ انگریزی فتوحات کو اس قدر بڑھا چڑھا کر نہ لکھیں اور واقعات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ شرائط صلح عین مناسب تھیں۔ دوسرے کارنوالس چاہتا بھی تو اپنے اتحادیوں کی رائے کے بغیر میسور کو بالکل فنا نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ اتحادی خاص کر مرہٹے زیادہ سخت شرائط کے خلاف تھے۔

[1] اوکس ہس صفحہ ۱۷۵۔

[2] واضح رہے کہ گورنر جنرل کو اس وقت تک مدراس، بمبئی کے مقامی انتظامات میں زیادہ دخل نہ تھا اور بنگالے کی طرح کوئی بڑا صوبہ بھی براہ راست انگریزوں کے قبضے میں نہ آیا تھا۔

یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے صوبوں کا بھی اسی طرح دوامی بندوبست کردیا جائے جو رعایا کی آسودگی کی نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں مگر معترضین کے شبہات کی تردید میں مختصر طور پر یہ جتا نامناسب نہ ہوگا کہ بنگالے کے لوگ آج ہندوستان کے دوسرے صوبے والوں سے زیادہ دولتمندو آسودہ حال ہیں۔ اسی آسودہ حالی کی بدولت وہاں تعلیم و تمدن اور آبادی میں جو ترقی ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اور غالباً اس سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ اُن کی یہ فلاح و خوش حالی بیشتر دوامی بندوبست کے طفیل ہے جس سے ہندوستان کے دوسرے صوبے اب تک محروم ہیں؛

سرجان شور

اگست ۱۷۹۳ء (۱۲۰۸ھ) میں کارنوالس کے عہدے کی میعاد ختم ہوئی اور اس کی سفارش پر سرجان شور گورنر جنرل مقرر ہوا۔ ونسنٹ اسمتھ سرجان شور کے ذاتی اوصاف اور خصائل نیک کا معترف ہے لیکن لکھتا ہے کہ ہند کے معدودے چند واقعی ناکارہ گورنر جنرلوں میں جو لوگ بدترین گذرے ہیں ان میں سے ایک سرجان شور بھی تھا۔ قانونِ ہند مجریہ ۱۷۸۴ء کی تعمیل لفظی اور مرہٹوں کے خوف نے اس کی عقل معطل کردی تھی۔ وہ ماتحت بنکر کام اچھا کرسکتا تھا لیکن کامل اختیارات پاکر حوصلہ مندی سے کام کرنا اس کا حصہ نہ تھا۔ چنانچہ نواب نظام الملک سے جو عہد نامہ ہوا تھا اس میں ایک لفظی بحث نکال کر اس نے فیصلہ کرلیا کہ کمپنی مدد دینے پر مجبور نہیں ہے درآں حالیکہ ریاست حیدرآباد کی طرف سے گنٹور کا علاقہ تفویض ہونے کا مقصد یہی تھا کہ وقت ضرورت کمک پہنچائی جائے گی مگر سرجان شور نے کمپنی کی نیک نامی کا مطلق خیال نہ کیا اور مدد سے انکار کرنے میں ایسی پوچ دلائل پیش کیں جن کا صاف مطلب یہ تھا کہ ایفائے عہد میں کمپنی کا کوئی مالی نفع نہ تھا۔ غرض جس وقت ۱۷۹۵ء (۱۲۰۹ھ) میں مرہٹہ سرداروں نے آخری مرتبہ متحد ہوکر بہت بڑی فوج سے ریاست حیدرآباد پر حملہ کیا تو سرجان شور نے نہایت خودغرضی اور سیاسی بزدلی سے علانیہ عہد شکنی کی اور نواب نظام الملک کو مدد دینے سے انکار کردیا[1]؛

---

[1] اوکس میں صفحہ ۷۰، ۷۵۔ مرہٹوں کو اس موقع پر (جنگ کھرواہیں) جو فتح حاصل ہوئی اس کا ہم پہلے باب میں ذکر کرچکے ہیں؛

لیکن اس برافروختہ مورخ نے سرجان شور کی کمزوریوں میں قانون کی غلامانہ پابندی کو جو ایک سبب قرار دیا ہے وہ آگے چلکر درست نہیں رہتا۔ کیونکہ دو ہی سال بعد جب نواب آصف الدولہ والی اودھ نے وفات پائی تو اگرچہ انگریزی حکومت نے اول اس کے (لے پالک) بیٹے نواب وزیر علی کو وارث صحیح تسلیم کر لیا تھا مگر چند ہی مہینے بعد سرجان شور نے "عدم مداخلت" کے اصول کو جس کی پابندی از روئے قانون ضروری تھی بالائے طاق رکھ کر نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی **سعادت علی خاں** سے ایک نیا معاہدہ کر لیا جس کی رو سے الہ آباد کا مشہور و باموقع قلعہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور فوجی مصارف کے نام سے جو روپیہ ریاست اودھ ادا کرتی تھی اُسے بڑھا کر ۷۶ لاکھ سالانہ کر دیا گیا۔ اس کے عوض میں وزیر علی معزول اور سعادت علی خاں والئ اودھ بنا دیے گئے (۱۷۹۸ء مطابق ۱۲۱۳ھ)
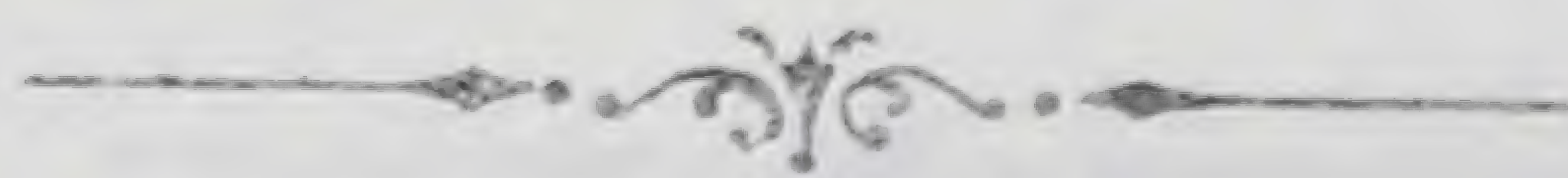
باب ۲

سیادتِ ہند کا منصوبہ

پہلی فصل۔ ولزلی کے ارادے اور کارنامے

نیا گورنر جنرل

رچرڈ ولزلی "لارڈ" کا خطاب پانے سے پہلے "ارل اوف مارننگٹن" کے خطاب سے مشہور تھا، اور گورنر جنرل مقرر ہونے سے قبل نظمائے کمپنی کی مجلس نظارت کا رکن رہ چکا تھا۔ اسے ہندوستانی معاملات اور دنیا کے عام سیاسی حالات سے کافی واقفیت تھی اور "لارڈ ڈلہوزی کی طرح وہ اس بات کا یقین کامل رکھتا تھا کہ ہندوستان کی دیسی حکومت سے انگریزی حکومت افضل ہے۔ اسی یقین کی بنا پر اس نے ہندوستان میں جدھر ہاتھ بڑھایا بے دھڑک دیسی رئیسوں کی حکومت سے ملک نکال کر انگریزی حکومت میں شامل کر لئے کیونکہ اس قسم کا ہر الحاق اس کے نزدیک بلا شک و شبہہ لوگوں کے حق میں مفید تھا[1]۔ ولزلی کے دو بھائی بھی اس کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے تھے جن میں سے ایک (آرتھر) ڈیوک اوف ولنگٹن

[1] ۔ اوکس ہس صفحہ ۵۸۰۔

اور دوسرا (ہنری) لارڈ کنولی کے خطاب سے مشہور ہوا۔ ولزلی کے ماتحت عہدہ داروں میں بھی الفنسٹن، ملکم وغیرہ بعض انگریز آگے چل کر بہت مشہور ہوئے۔ اور حق یہ ہے کہ جیسے پرجوش شائق فتوحات انگریز مدبر ولزلی کے دور میں جمع ہوگئے تھے عرصے تک پھر ہندوستان میں جمع نہ ہوئے ہونگے۔ اس اولوالعزمی اور شوق کشورکشائی کا ایک سبب ولزلی کی جوان سالی تھی کہ جب کمپنی کی طرف سے وہ گورنر جنرل ہوکر ہندوستان آیا (مئی ۱۷۹۸ء مطابق ۱۲۱۲ھ) تو اس کی عمر چالیس برس کی بھی نہ تھی، دوسرے ملک فرانس کی رقابت اور نپولین بوناپارٹ کے ساتھ کشمکش نے بھی اس زمانے کے انگریزوں میں تازہ جوش پیدا کر دیا تھا اور جہاں جہاں ممکن تھا وہ اپنے استحکام قوت کی دھن میں لگے ہوئے تھے؛

معاملات دکن

ہندوستان کے انگریز حکام کو سب سے زیادہ کد سلطانِ میسور کے ساتھ تھی۔ اور وہ بھی اپنی جگہ برابر ان کے خلاف ساز و باز کرتا رہتا تھا اُسے اپنے ہم وطن ہمسائیوں سے بھی نہایت بدگمانی اور خصومت تھی، اور اس بات سے ناامید ہو چکا تھا کہ یہ ہمسائے انگریزوں کی نوخیز قوت کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد کریں گے؛ دراصل پونا کے مرہٹہ سردار تو باہمی نفاق و خودغرضی کے مرض میں ایسے گرفتار تھے کہ کھرڈا کی فتح سے جو بیش قیمت علاقے انھوں نے حاصل کئے تھے تین چار سال کے اندر ان کا بیشتر حصہ ہاتھ سے نکل گیا اور حکومت پونا کوئی تدارک نہ کرسکی۔ لیکن حیدرآباد کے اہل الرائے کو "نو دولت" حیدرعلی اور اس کے جانشین کے ساتھ ابتدا سے اختلاف تھا۔ اور گذشتہ جنگ میسور نے بھی اس اختلاف کو بڑھا دیا۔ لہذا ٹیپو سلطان جیسے خوددار اور خودسر فرمانروا کو حیدرآباد کی طرف سے کسی بھلائی کی آرزو تھی نہ امید۔ اسی کے ساتھ وہ خوب جانتا تھا کہ ایسے قوی دشمنوں میں ریاست میسور کی سلامتی دشوار ہے۔ خود اس کا ملک اس قدر چھوٹا تھا کہ وہ تنہا اپنی قوت سے متحدہ ہمسائیوں کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ گذشتہ جنگ کے نقصانات کی تلافی ہی میں اس کے کئی سال صرف ہوگئے تھے؛ ایک صورت اپنے بچانے کی یہ تھی کہ انگریزوں سے جن شرائط پر ممکن ہو مصالحت کرلی جائے۔ مگر انگریزوں کے سامنے جھکنا

باب ۲

سلطانِ میسور کو کسی حال میں گوارا نہ تھا۔ دوسرے کرناٹک اور بنگالے کی نظیریں اس کے سامنے تھیں جہاں انگریزوں کے روزافزوں رسوخ نے رفتہ رفتہ تسلطِ حاکمانہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔

الغرض، ٹیپو سلطان کی حفاظتِ خود اختیاری کی کوشش اب ایک مایوسانہ جدوجہد بن گئی تھی کہ کبھی تو وہ مرہٹوں کو انگریزوں سے توڑنے کی سعی کرتا کبھی ریاستِ حیدرآباد کی بیرونی اور اندرونی لڑائیوں میں سازباز کرتا اور کبھی اپنے ایلچی کابل بھیجتا کہ احمد شاہ ابدالی کے پوتے زماں شاہ کو ہندوستان فتح کرنے کی ترغیب دے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اگر اسے واقعی کسی بیرونی قوم سے مدد کی امید پیدا ہوئی تو وہ فرانسیسی تھے جن کی انگریزوں کے ساتھ مدت سے قومی جنگ ٹھنی ہوئی تھی۔

فرانسیسیوں کا حصہ معاملاتِ ہند میں

ہندوستان میں اہلِ فرانس کی جنگی قوت کے ٹوٹنے کا حال گذشتہ اوراق میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور پانڈی چیری کی آخری تسخیر (۱۷۶۱ء مطابق ۱۱۷۴ھ) کے بعد سے وہ ہندوستان میں کوئی ایسا مقام حاصل نہ کر سکے تھے جو ان کی جنگی اور سیاسی قوت کا مرکز بن جاتا۔ تاہم اس قوم کے اکثر افراد ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود تھے اور بعض نے دیسی ریاستوں کی ملازمت میں کافی رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ آتشی اسلحہ کی ساخت اور استعمال میں ان کی ہنرمندی صدیوں سے ہندوستان میں مشہور تھی لیکن بارھویں صدی ہجری میں قومی انحطاط نے اہلِ ہند کو سپاہیانہ فنون میں بھی پسماندہ کر دیا تھا اور اس عہد میں ریمون، ڈی بوئنی، پیران، لا، سمرو وغیرہ فرنگی سپہ سالاروں کے نام آوری پانے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ خود اہلِ ہند میں جنگی انتظام اور سپہ سالاری کی قابلیت فوت ہوتی جاتی تھی۔

ریاستِ میسور میں ایسے کسی فرنگی سپاہی کو شہرت حاصل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ تھا کہ خود حیدر علی اور اس کے بیٹے اعلیٰ درجے کے سپہ سالار اور جنگی انتظامات میں فرنگی سرداروں کی مدد سے مستغنی تھے۔ ورنہ انگریزوں کی رقابت نے حکومتِ میسور کو ابتدا سے اہلِ فرانس کا دوست بنا دیا تھا اور بالخصوص

ٹیپو سلطان کے عہد حکومت میں میسور کا پائے تخت بہت سے آوارہ گرد فرانسیسیوں کا مستقر بن گیا تھا۔ جہاں انھوں نے انقلاب فرانس کی یادگار میں جمہوریت پسندوں کی ایک باقاعدہ انجمن بنائی (۱۷۹۷ء) اور خود سلطان میسور کا نام فرانس کے "آزاد شہریوں" میں درج کر لیا تھا؛

اندرونی استحکام اور جنگی تیاریوں کے ساتھ ٹیپو سلطان کی یہ سب کوششیں دراصل دفاعی نوعیت رکھتی تھیں بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ اگر وہ انگریزوں کی بیخکنی کے درپے تھا تو اس کی بڑی وجہ بھی اب یہ رہ گئی تھی کہ ان کی قوت پذیری میں خود اسے اپنی ریاست کے لالے پڑے تھے۔ ورنہ اسے فرانسیسیوں سے اگر کسی بڑی امداد یا ہند پر حملے کی امید تھی بھی تو تھوڑے ہی دن بعد نپولین کی مصر و شام میں ناکامی (۱۷۹۸ء) نے اسے باطل کر دیا؛ البتہ سلطان میسور کی اہل فرانس کے ساتھ دوستی، انگریزوں کے خلاف جنگی اتحاد کے منصوبے اور نپولین یا جزیرہ موریشس کے فرانسیسی گورنر سے خط کتابت انگریزوں کو اشتعال دلانے کے کافی اسباب تھے۔ نئے گورنر جنرل کے دل میں شوق کشورکشائی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مدراس کے انگریز حکام نے ہر چند لیت و لعل کی[۱] ولزلی نے ایک نہ سنی اور سلطان میسور کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا؛

میسور کی آزادی کا خاتمہ۔

اسے تقدیر کی یاوری سمجھنا چاہیے کہ ولزلی کے عزم مصمم کو ایک غیر متوقع واقعے سے بڑی تقویت پہنچ گئی۔ وہ یہ کہ اسی زمانے میں حیدرآباد کے فرانسیسی سپہ سالار موسیو ریموں نے وفات پائی۔ اور وہ جرار سپاہ جسے فرانسیسیوں کی سعی و قابلیت نے ہندوستان کی بہترین فوج بنا دیا تھا۔ سیاسی تدبیروں سے بالآخر خستہ انگریزوں کے قابو میں آگئی اور اسے ہتھیار لے کے برطرف کر دیا گیا۔ اس واقعے کا ہم اس کتاب کے پہلے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں دہرانے سے

---

[۱] مدراس کے گورنر نے اول تو جنگ کے جوکھوں میں پڑنے کو احتیاط کے خلاف بتایا دوسرے بتایا کئی بار ولزلی کو یاد دلایا تھا کہ میسور پر فوج کشی کرنا قانون ہندوستان مجریہ ۱۷۸۴ء اور نیز معاہدۂ سرنگاپٹن کے خلاف ہے (میدرعلی "سلطان" صفحات ۲۸۱ وغیرہ)

یہ جتانا مقصود ہے کہ اس طرح بغیر لڑے بھڑے ریاست حیدرآباد کے بے بس رہ جانے سے جہاں یہ ریاست انگریزوں کے زیر اثر آگئی وہیں فتح میسور میں بھی آسانیاں پیدا ہو گئیں کیونکہ گو حکومت حیدرآباد کی ٹیپو سلطان سے مخالفت تھی لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ انگریزوں کا میسور پر قابض ہو جانا پسند نہ کرے گی اور اگر ٹیپو سلطان کو مدد نہ دے تو بھی کم سے کم اپنے فرانسیسی سرداروں کے اثر سے جنگِ میسور میں کوئی حصہ نہ لے گی۔ مگر یہ سب قیاس غلط ثابت ہوئے۔ مذکورۂ بالا واقعے نے صورتِ حالات کو بالکل بدل دیا۔ اور اب حیدرآباد کی فوج انگریزوں کے حلیف کی حیثیت سے میسوری علاقوں پر حملہ آور ہوئی۔

میسور کی اس چوتھی اور آخری جنگ نے زیادہ طول نہ کھینچا۔ بلکہ تین چار مہینے کے اندر ختم ہو گئی (۱۷۹۹ء مطابق ۱۲۱۳ھ) شروع سے اتحادیوں نے بڑے ساز و سامان اور اہتمام کے ساتھ تین طرف سے زغہ کیا تھا۔ اور ان کی زبردست فوجوں نے کامیابی سے بڑھ کر سری رنگ پٹن کا محاصرہ کر لیا۔ آغازِ جنگ سے محاصرے کے وقت تک سلطان میسور نے کئی بار صلح کی سلسلہ جنبانی کی لیکن ولزلی اس کی آزادی کا خاتمہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا اور "شیر میسور" کو انگریزوں کی محکومانہ اطاعت کسی حال میں گوارا نہ تھی وہ بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کی موت اور سری رنگ پٹن کی تسخیر کے ساتھ تمام ریاست فتحمندوں کے ہاتھ میں آگئی۔ میسور کا تقریباً نصف علاقہ وہاں کے قدیم راجاؤں کے خاندان کے نام واگذاشت کر دیا گیا تھا لیکن وہ بھی مدت دراز تک انگریزی رزیڈنٹ کے اختیار و نگرانی میں رہا۔ باقی نصف میں سے چند اضلاع ریاست حیدرآباد کے حصے میں آئے تھے مگر ولزلی نے سال ڈیڑھ سال بعد ہی فوجی مصارف کے نام سے انھیں واپس لے لیا۔ یہ مصارف اس انگریزی فوج کے تھے جسے نئے معاہدے کی رو سے نواب نظام الملک کو اپنے ملک میں رکھنا ضروری تھا۔

مزید مقبوضات (الحاقی)

میسور کا قبضہ جنگ و فتح کا ثمرہ تھا لیکن ادھر سے فرصت ملتے ہی ولزلی نے ان ریاستوں پر قبضہ کرنا شروع کیا جو اب تک انگریزوں کی دوست یا

"زیر حفاظت" تھیں۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ولزلی جس طرح ممکن ہو انگریزی مقبوضات بڑھانے چاہتا تھا[1]۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ اپنی اس حکمت عملی کو وہ قانون ۱۷۸۴ء کے عین مطابق بتاتا تھا۔ جس کے یہ الفاظ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ "ہندوستان میں فتوحات اور اضافہ مقبوضات کے منصوبوں پر عمل کرنا.... اہل انگلستان کی خواہش، راستبازی اور اصول عمل کے سراسر منافی" ہے!

بہر حال سب سے اول انگریزی حکومت نے تنجور و سورت کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کیا (۱۷۹۹ء) جو مدت سے کمپنی کی دوستدار تھیں۔ پہلی ریاست کی وراثت کے متعلق راجہ کے خاندان والوں میں نزاع تھی۔ انگریزوں نے سمجھا بجھا کر مسند نشین راجہ کو آمادہ کر لیا کہ وہ کمپنی سے وظیفہ لے کر ریاست سے دست بردار ہو جائے[2]۔ ابھی دونوں سورت کے نواب نے وفات پائی اور اس کی ریاست کے متعلق بھی "اسی قسم کا انتظام" کر دیا گیا۔ اس الحاق کے دو سال بعد نواب عمدۃ الامراء والی کرناٹک نے وفات پائی۔ (۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء) اس ملک میں نواب محمد علی ہی کے زمانے سے انگریزوں کا بہت کچھ رسوخ جم گیا تھا اور ایک دوسرے مرتبہ انھوں نے تمام اختیارات بھی (انتظام کے لئے) نواب سے لے لئے تھے۔ بایں ہمہ نواب محمد علی اور عمدۃ الامرا جس طرح ممکن ہوا اپنا بھرم بنائے رہے اور ان کی بڑی تدبیر یہ تھی کہ مدراس کے انگریز حکام کو رشوتیں اور نذرانے دے دے کر اپنا طرفدار کر لیتے تھے۔ لیکن ولزلی پر یہ جادو کارگر نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے عمدۃ الامرا کے فرزند علی حسین سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ سالانہ وظیفہ لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔ علی حسین میں انگریزوں سے لڑنے کی قوت نہ تھی لیکن اس کی غیرت نے اس قسم کا عہد و پیمان کرنا

[1] ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ "ملک گیری کے اصول اور اس یقین واثق نے کہ جو علاقہ براہ راست انگریزوں کے قبضے میں آئے گا اس کی فلاح و بہتری میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں، ولزلی کو آمادہ کر دیا کہ کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دے۔" (اوکس ہس ص ۵۸۸)

[2] اوکس ہس ص ۵۸۸۔

گوارا نہ کیا اور شاید اس کو یہ بھی امید تھی کہ انگلستان میں کوشش کی جائے گی تو گورنر جنرل کا فیصلہ منسوخ ہو جائے گا۔ مگر ولزلی اس کی پیش بندی کر چکا تھا[1]۔ ادھر نواب محمد علی کا ایک دوسرا پوتا (عظیم الدولہ) سالانہ وظیفے پر خطاب نوابی لے کر ریاست چھوڑ نے پر آمادہ ہو گیا اور ولزلی نے اسی کو عمدۃ الامرا کا جانشین مان کر علاقۂ کرناٹک کا الحاق کر لیا۔

یہ جولائی ۱۸۰۱ء (۱۲۱۵ھ) کا واقعہ ہے۔ اس سے چند مہینے قبل (جنوری ۱۸۰۱ء) نواب وزیر والی اودھ نے "جو اپنی بے بسی کی وجہ سے کرب کی حالت میں تھا" ایک نئے معاہدے پر مجبوراً دستخط اور تقریباً آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کر دیا جس میں گورکھپور، بریلی، فتح پور وغیرہ متعدد زرخیز اضلاع شامل تھے۔ ولزلی کی اس کارروائی کو ونسنٹ اسمتھ نے بھی جو اس کا بہت مداح اور طرفدار ہے قابل اعتراض اور نری زبردستی تسلیم کیا ہے[2]۔

مرہٹوں کے معاملات

اب نواب نظام الملک کی طرح والی اودھ بحیثیت ایک ماتحت حلیف کے، اور کرناٹک و میسور بحیثیت ملک مفتوحہ کے حکومت انگریزی کے ہاتھ میں تھے۔ اور ہندوستان بھر میں صرف مرہٹے انگریزوں کے حریف مقابل رہ گئے تھے۔ پنجاب نے ابھی تک آزاد ریاست کی حیثیت یا کوئی قابل ذکر قوت حاصل نہیں کی تھی۔ سلاطین مغلیہ کے وارث کو عمر و حکومت کے انحطاط نے بیکار کر دیا تھا۔ لہٰذا ولزلی نے جسے تمام کشور ہند پر انگریزی سیادت قائم کرنے کی دھن بندھی ہوئی تھی، مرہٹوں کی طرف توجہ مبذول کی اور پیشوا باجی راؤ (ثانی) کو انگریزوں کے ساتھ اسی قسم کا معاہدہ ("عہد معاونت") یا سب سڈیری الائنس) کرنے پر آمادہ کیا جیسا کہ دو سال پہلے نواب نظام الملک نے کیا تھا اور جس کی

---

[1] نواب محمد علی اور عمدۃ الامرا کے چند خطوط ولزلی نے مہیا کئے تھے جن سے ان کی والیٔ میسور کے ساتھ سازباز ظاہر ہوتا تھا لیکن اول تو ان کی اصلیت ہی مشتبہ تھی (اوکس ہس ۱۸۵) دوسرے اگر درست بھی تھی تو بھی باپ دادا کے جرم کی علی حسین خاں کو سزا دینی کچھ قرین انصاف و دوستی نہیں نظر آتی۔

[2] اوکس ہس صفحہ ۵۹۰۔

رو سے معاہدہ کرنے والی ریاست کو ایک انگریزی فوج اپنے خرچ سے ملک میں رکھنی پڑتی تھی کہ بوقت ضرورت سرکار انگریزی کو مدد دے۔ نیز اقرار کرنا ہوتا تھا کہ وہ (ریاست) حکومتِ انگریزی کے مشورے کے بغیر کسی دوسری ریاست سے نہ جنگ کرے گی نہ اتحاد۔ اور نہ انگریزوں کے سوا کسی دوسری فرنگی قوم کے آدمی کو اپنی سرحد میں نوکر رکھے گی۔

یہ شرطیں قبول کرنا گویا انگریزوں کی سیادت یا سیاسی برتری تسلیم کر لینا تھا۔ ولزلی کے خیال میں ان سے کم شرائط پر کسی دیسی رئیس کے ساتھ مصالحت رکھنی ممکن نہ تھی اور پیشوا سے ان شرطوں کے مان لینے پر وہ اس طرح اصرار کرتا تھا کہ گویا اُسے اس امر کا مطلق احساس ہی نہیں کہ وہ درحقیقت پیشوا اور تمام مرہٹہ سرداروں کو اس بات کی صلاح دے رہا ہے کہ اپنی خود مختاری چھوڑ کر انگریزوں کے محکوم محض بن جائیں۔[1]

یہ بات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے کہ ولزلی پیشوا کی کمزوری اور دوسرے مرہٹہ رئیسوں کی قوت و خود مختاری سے بے خبر ہو۔ لیکن سب سے اول پیشوا کے ساتھ معاملہ کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ اگر مرہٹہ قوم کا یہ برائے نام سردار قابو میں آگیا تو پھر دوسرے رئیسوں کے معاملات میں دخل دینے کا قانونی جواز پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ گو وہ رئیس اپنی اپنی جگہ مدت سے خود مختار ہو گئے تھے لیکن رسمی طور پر پونا کی صدر حکومت کے تابع تھے۔ دوسرے یہ کہ مرہٹوں کی چاروں آزاد قوتوں میں پیشوا ہی کی قوت سب سے کمزور نظر آتی تھی اور نانا فرنویس کی وفات (۱۸۰۰ء) کے بعد پونا میں حصولِ اقتدار کے لئے جو خانہ جنگی بپا ہوئی اس نے پیشوا کو اور بھی پریشان اور بیرونی امداد کا محتاج بنا دیا تھا۔

بایں ہمہ باجی راؤ اول اول ولزلی کی مذکورۂ بالا شرطیں ماننے پر تیار نہ تھا اور اسے امید تھی کہ پونا کے اندرونی جھگڑوں میں خود اس کا فریق کامیاب ہوگا۔ لیکن اسے انگریزوں کے نصیب کی یاوری کہنا چاہیے کہ مرہٹوں کی

---

[1] اوکس ص ۵۹۶۔

باب ۲

اس خانہ جنگی کے سب سے خونریز معرکے میں پیشوا کے دوست دولت راؤ (سندھیا) کو شکست ہوئی اور میدان جسونت راؤ ہلکر کے ہاتھ رہا۔ (جنگ پونا۔ اکتوبر ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ) سندھیا کے شکست کھاتے ہی باجی راؤ پونا سے بھاگ گیا تھا پھر جسونت راؤ ہلکر نے ہرچند اس کو بلایا اور صلح و آشتی کی تدبیریں کیں، وہ نہ آیا۔ اور یہ واقعہ اس زمانے کے طبقۂ اعلیٰ کی دماغی اور اخلاقی کیفیت ظاہر کرتا ہے کہ باجی راؤ نے اپنے ہم وطنوں کی دوستی بازیادہ سے زیادہ محکومی قبول کرنے پر انگریزوں کی محکومی قبول کرنے کو ترجیح دی اور انگریزی امداد کے معاوضے میں ولزلی کی تمام شرطیں تسلیم کرلیں[1] (عہدنامہ بسین دسمبر ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ)۔

دوسری جنگ مرہٹہ

اب ایک انگریزی فوج نے باجی راؤ کو ساتھ لے کر پونا پر پیشقدمی کی۔ ہلکر اپنی مذکورۂ بالا کامیابی کے بعد باجی راؤ کے بھائی (امرت راؤ) کو پیشوا بنا گیا تھا لیکن اس نے یعنی (امرت راؤ) نے باجی راؤ کے دوبارہ پونا آنے کی مزاحمت نہ کی اور سالانہ وظیفہ لے کر بنارس چلا گیا۔ باجی راؤ انگریزوں کی مدد سے دوبارہ حکومت پونا پر بحال ہوا اور اس واقعے کی اطلاع کے ساتھ ہی برار کے بھونسلا راجہ اور مالوے کے ہلکر و سندھیا رئیسوں کو ولزلی نے جتا دیا کہ اب اسی قسم کا معاہدہ کئے بغیر، جسے باجی راؤ نے قبول کرلیا ہے کوئی مرہٹہ رئیس پونا کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ پھر بھونسلا سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی فوجیں کمپنی کے حلیف نواب نظام الملک کی سرحدوں کے قریب سے دور ہٹالے۔ جب اس کی تعمیل میں تاخیر ہوئی تو ولزلی نے، جو پہلے ہی وسیع پیمانے پر جنگ کے ساز و سامان کر رہا تھا، اعلان جنگ کر دیا (اگست ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ)۔

اس جنگ کے مشہور معرکے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہوئے اور

[1] یعنی انگریزوں کی امداد سے اپنی حکومت پر بحال ہونے کے عوض میں۔ انگریزی فوج کی کم سے کم چھ پلٹنیں اپنے ملک میں رکھنی اور ان کے مصارف (۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ) ادا کرنے قبول کئے۔ سورت اور بڑودہ پر حکومت پونا کو جو دعاوی تھے، سب سے باجی راؤ دست بردار ہوگیا اور "عہد معاونت" کی دیگر شرائط بھی تسلیم کرلیں۔

اول اول بھونسلا اور سندھیا کے مقابلے میں انگریزوں کو قریب قریب ہر جگہ کامیابی ہوئی لیکن ہلکر نے جو اندرونی نفاق کی وجہ سے اپنے ہم قوموں کے ساتھ شریک نہ ہوا تھا۔ جاٹوں اور پنڈاروں کی مدد سے اپنا علیحدہ جتھا بنایا اور اگرچہ اس کے تحت نہ اس قدر بڑی اور منظم فوج تھی نہ ایسا عمدہ سازوسامان تھا جیسا کہ انگریزوں یا سندھیا کے پاس تھا بایں ہمہ انگریزوں کو سب سے زیادہ دشواری نیز ناکامی اسی کے مقابلے میں پیش آئی اور حق یہ ہے کہ انھی آخری معرکوں نے ولزلی کی فتوحات اور ناموری کو بہت کچھ دھندلا کر دیا اور انگلستان میں ناظمانِ کمپنی اس سے ناراض ہو گئے۔

کمپنی کا غلبہ سندھیا اور بھونسلا پر۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ دولت راؤ سندھیا کا مالوے اور نواح دہلی کے علاقوں پر قبضہ تھا۔ شاہ عالم کو اسی زمانے میں اس نے نجیب آباد کے پٹھانوں سے نجات دلائی مگر خود اپنا محکوم بنا لیا۔ پونا میں اسے ہلکر کے مقابل شکست ہوئی لیکن ابھی وہ دوبارہ وہاں اپنا اقتدار جمانے سے مایوس نہ ہوا تھا اور آغازِ جنگ کے وقت بھی دکن ہی کے علاقوں میں بھونسلا کا شریک و مددگار تھا۔ ان وسیع ذمہ داریوں نے اوّل تو اس کی فوجی قوت کو منقسم کر دیا دوسرے جنگ چھڑتے ہی انگریزوں نے اعلان کیا کہ مرہٹوں کی فوج کے جو فرنگی یا ہندوستانی سردار و سپاہی نوکری چھوڑیں گے انھیں اسی تنخواہ پر کمپنی کی سرکار میں ملازمت دے دی جائے گی۔ چنانچہ بہت سے انگریز اور دوسرے فرنگی جو سب سے زیادہ تعداد میں سندھیا کے ملازم تھے عین لڑائی کے وقت علیحدہ ہو گئے اور اس واقعے نے بھی اس کی جدید قواعد داں فوج کو ایک حد تک کمزور کر دیا ہے[۱]

جنگ کا پہلا معرکہ اورنگ آباد کے قریب آسئی میں ہوا (ستمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ) اور قلتِ تعداد کے باوجود ولزلی کے بھائی آرتھر ولزلی نے بھونسلا اور سندھیا کو شکست دی۔ سندھیا نے اپنی فوجیں شمال میں ہٹا لیں اور بھونسلا کو ایک اور شکست کھا کے اطاعت یا اسی قسم کی شرطیں قبول کرنی پڑیں (عہد نامہ دیوگاؤں نومبر ۱۸۰۳ء) جیسی کہ پیشوا مان چکا تھا۔

[۱] ڈف کی تاریخ مرہٹہ، جلد سوم ۲۴۴۔

"مرہٹہ جتھے" میں سب سے زیادہ قوی سردار سندھیا تھا۔ اس کی فوجیں فرنگی سرداروں کے ماتحت آتشی اسلحہ سے مسلح اور مغربی قواعد و اصول کے مطابق مرتب و آراستہ کی گئی تھیں اور مشہور تھا کہ جیسا زبردست توپخانہ سندھیا کا ہے ایسا ہندوستان میں کسی کے پاس نہیں۔ آسٹی کی جنگ میں جب سندھیا کو پسپا ہونا پڑا تو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اس لڑائی میں وہ اپنی پوری فوج اور قوت سے کام نہیں لے سکا تھا۔ لیکن اسی سال جنرل لیک نے اس کی شمالی فوجوں کو جابجا شکستیں دیں اور آخر میں پہلے دہلی کے قریب سندھیا کے بہت بڑے لشکر پر نمایاں غلبہ حاصل کیا (ستمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ) اور پھر آگرہ سے لے کر الور کے قریب ایک خونریز معرکے میں کامل فتح پائی (جنگ لاسواری اکتوبر ۱۸۰۳ء)

اس طرح چند ہی مہینے کے اندر سندھیا کا زور ٹوٹ گیا اور اسے بھی انگریزوں سے دب کر صلح کرنی پڑی (عہدنامہ سورجی ارجن گاؤں۔ دسمبر ۱۸۰۳ء) جس کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ سندھیا آئندہ "ہندوستان خاص" کے علاقے اور بادشاہ دہلی کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھے گا؛ حقیقت میں یہ انگریزوں کی بہت بڑی کامیابی تھی اور اسی بنا پر اگر ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) کو ممالک ہندیران کی حکومت کا پہلا سال قرار دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ لیکن اول تو اتنے وسیع ملک پر خاطر خواہ تسلط قائم ہونے میں قدرۃً تاخیر و دشواری پیش آئی دوسرے مرہٹوں کے تیسرے سردار ہلکر کی لڑائیوں نے بھی خلاف امید اس قدر طوالت اور ایسی صورت اختیار کرلی کہ لارڈ ولزلی کو اپنی فتوحات پر پوری طرح خوش ہونے کا موقع نہ مل سکا اور کم سے کم چند سال کے لئے انگریزی "سیادت" کی تکمیل مشتبہ نظر آنے لگی۔؛

ہلکر سے لڑائیاں

اندور کے اس مرہٹہ رئیس (ہلکر) کی پونا میں عارضی کامیابی کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اول اول اس نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تو اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ وہ سندھیا اور بھونسلے کا رقیب تھا۔ دوسرے ہلکر اُن قدامت پسند مرہٹوں میں تھا جو تیرھویں صدی ہجری (انیسویں عیسوی) کے

شروع ہو جانے پر بھی فن جنگ کے جدید اصول و قواعد کی ہنسی اڑاتے تھے اور کم سے کم اپنی قوم مرہٹہ کے لئے اسی "قزاقانہ جنگ" کے طریقوں کو مناسب و موزوں سمجھتے تھے جو ملک عنبر حبشی کے زمانے سے لے کر دوسرے پیشوا باجی راؤ کے عہد تک اہل دکن میں بہت مقبول تھے۔ جب سندھیا کو انگریزوں کے مقابلے میں ہر جگہ شکست ہوئی تو گویا ہلکر کے مذکورۂ بالا خیالات کی تصدیق ہو گئی اور اس کی نہ صرف عزت و قدر اپنے ہموطنوں میں بڑھی بلکہ اب ہندوستان بھر میں اسی کی ایک ریاست اور قوت ایسی رہ گئی جو ممالک ہند کے نو وارد و عویداروں سے مغلوب نہ ہوئی تھی۔

ان اسباب نے سیاسی اقتدار کے ساتھ ہلکر کا غرور بڑھا دیا اور حکومت انگریزی کی طرف سے مصالحت اور عہد معاونت کی تحریک ہوئی تو اس نے جواب میں اس قسم کے مطالبات کئے جنھیں ولزلی جیسے شاہانہ مزاج کا آدمی اس قدر فتوحات حاصل کرنے کے بعد کبھی قبول نہ کر سکتا تھا۔ غرض نئے عیسوی سال (۱۸۰۴ء) میں دوبارہ جنگ شروع ہو گئی اور شمالی ہند، گجرات اور دکن تین طرف سے انگریزی افواج نے ہلکر کے علاقوں پر پیشقدمی کی۔ سندھیا نے بھی انگریزوں کی اعانت کا اقرار کیا تھا اور اول اول اس کے چند دستے انگریزوں کے ساتھ تھے لیکن گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ جب ابتدا میں انگریزوں کو ناکامی ہوئی تو یہ مرہٹہ سپاہی انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر ہلکر سے جا ملے[1]۔

جنوب آگرہ کے جاٹ اور پنڈاروں کا سرگروہ امیر علی اس لڑائی میں ہلکر کے رفیق ہو گئے تھے اور خود ہلکر کا قول یہی تھا کہ ہمارا ملک و مال گھوڑے کی زین پر ہے! بالفاظ دیگر یہ وسیع پیمانے پر ایک قزاقانہ جنگ تھی کہ وہ غنیم جو والیان بنگال اودھ، سلطان میسور و سندھیا کی منتظم افواج سے مغلوب نہ ہو سکا شاید ہلکر کے ان بے قاعدہ جرگوں کے ناگہانی حملوں سے تنگ آ کر ہٹ جائے۔ اتفاق سے گجرات و دکن کی انگریزی فوجیں بھی وقت پر مالوہ نہ پہنچ سکیں اور الور و جے پور کی طرف سے جو فوج کرنل مونسن کے ماتحت بڑھی تھی اُسے چنبل کے جنوب میں

---

[1] تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۲۷۵ و ۲۷۱ و ۲۸۲۔

ہلکر نے سخت شکست دی (جنگ مکن درا۔ جولائی ۱۸۰۴ء مطابق ۱۲۱۹ھ) مون سن پسپا ہوا اور اس پسپائی میں سخت مصیبتیں اٹھاتا ہوا بیانہ تک آیا۔ اس اثنا میں گریزپا مرہٹے اور پنڈارے برابر انگریزی فوج کے گرد منڈلاتے اور حملے کرتے رہے۔ مون سن کے تھکے ہارے سپاہی آخر ان پیہم حملوں کی تاب نہ لاسکے اور بیانہ کی لڑائی میں ان کی صفیں اور ترتیب ٹوٹ گئی اور جس کا جدھر منہ اٹھا فرار ہو گیا[1] (اگست ۱۸۰۴ء)۔

اس کامیابی نے ہلکر کے حوصلے بڑھا دیئے۔ ہندوستان میں ہر طرف اس کی ہمت و بہادری کے چرچے ہونے لگے اور اگرچہ دکن اور مالوے میں اس کے قدیم مقبوضات پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا لیکن ان باتوں کی اسے چنداں پروانہ تھی۔ اس کا "ملک و مال گھوڑے کے زین پر" تھا۔ دوسرے اب وہ آگرے سے بڑھکر دہلی پر پیشقدمی کر رہا تھا کہ جس طرح ممکن ہو شاہ عالم بادشاہ تک پہنچ جائے اور ظاہر میں لوگوں کی نظر میں وہی رسوخ و مرتبہ حاصل کر لے جو پائے تخت دہلی پر قابض ہونے کی بدولت پہلے سندھیا کو اور اب انگریزوں کو حاصل ہو گیا تھا۔

مگر واضح رہے کہ ہلکر کی ساری کامیابی ایک ایسے پریشان حال لشکر کے مقابلے میں ہوئی تھی جو پہلی ناکامی کے بعد خود ہی جنگ سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کرتا رہا۔ ورنہ ہلکر کے بے قاعدہ گروہ کسی مستقل مزاج حریف سے جم کر لڑنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ جب دہلی کی مٹھی بھر انگریزی فوج نے استقلال کے ساتھ مدافعت کی تو چند ہی روز میں ہلکر کے بے چین سپاہیوں کا دل گھبرا گیا اور وہ ہٹ کر دوآب کے علاقوں میں پھیل گئے۔

جنگ ڈیگ اور بھرتپور

لیکن اب خود جنرل لیک ہلکر کے مقابلے میں پہنچ گیا تھا اور یہ وہ لائق و مستعد سپہ سالار ہے کہ اگر انگریزوں کی سلطنتِ ہند کو فقط ان کی جنگی فتوحات کا نتیجہ سمجھا جائے تو شاید لیک سے زیادہ کوئی شخص انگریزوں میں بانیِ سلطنت کہلانے کا

[1] تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم صفحہ ۲۸۵

مستحق نہ ہوگا، مگر اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہیے کہ لیک یا دوسرے انگریز سپہ سالاروں کے ماتحت جو سپاہ تھی اس میں قریب قریب تمام ہندوستانی سپاہی تھے اور انھی کو انگریزوں کے ماتحت جدید قواعدِ جنگ سکھا کر مغربی طور پر مرتب و آراستہ کر لیا جاتا تھا۔ پس انگریزوں کی جنگی فتوحات میں سپاہیوں کا جس قدر حصہ تسلیم کیا جائے اس کے حقدار ہندوستان ہی کے باشندے ہوں گے اور "افواج انگریزی" سے بھی یہاں عام طور پر اہلِ ہند ہی کی وہ فوجیں مراد ہیں جو سرکار کمپنی کی ملازم اور انگریز سرداروں کے ماتحت تھیں۔

القصہ لیک نے نہایت خوبی سے ہلکر کی فوجوں کو ہر طرف سے گھیر گھیر کر دوبارہ میوات یعنی آگرہ اور دہلی کے مغرب میں ہٹنے پر مجبور کیا جہاں اس کے جاٹ حلیفوں کے بعض مستحکم قلعے بنے ہوئے تھے۔ انھی میں سے دو قلعوں کی پناہ لے کر ہلکر نے دو بڑی لڑائیاں لڑیں مگر دونوں جگہ ناکامی ہوئی۔ پہلے ڈیگ کا قلعہ انگریزوں نے تسخیر کر لیا اور اس کے بعد قلعہ بھرتپور کو گھیر کر کئی مرتبہ یورش کی۔ سپاہیوں کی دلیری اور جاں بازی کے باوجود یہ قلعہ فتح نہ ہو سکا لیکن ہلکر کی فوجیں مایوس و ناکام ہو کر یہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ لہٰذا اس کے حلیف راجہ بھرتپور نے انگریزوں سے صلح کر لی اور بیس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ اور ہلکر سے قطع تعلق کرنے کی شرطیں مان لیں۔ (۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۱۹ھ)۔

صلح

ہلکر اپنے جاٹ حلیفوں کو صلح پر آمادہ دیکھ کر وسطی راجپوتانہ میں ہٹ گیا تھا اتفاقاً اسی زمانے میں سندھیا سے ولزلی کی ایسی ان بن ہو گئی کہ دوبارہ جنگ کے آثار نظر آنے لگے۔ لہٰذا جب تک ہلکر کو امید رہی کہ شاید سندھیا اس کے ساتھ مل کر پھر ایک مرتبہ انگریزوں سے تیغ آزمائی کرے اس وقت تک وہ اجمیر میں ٹھیرا رہا۔ لیکن اس اثنا میں نظمائے کمپنی نے مختلف اسباب سے جن کا ذکر آگے آتا ہے لارڈ ولزلی کو واپس بلا کر کارنوالس کو دوسری مرتبہ ہندوستان بھیجا (جولائی ۱۸۰۵ء) تو اس نے آتے ہی سندھیا سے مصالحانہ گفتگو شروع کر دی۔ ادھر لیک نے بھرتپور سے فرصت حاصل کرتے ہی پھر تھوڑی سی فوج ہلکر کے تعاقب میں روانہ کی اور اس نے سندھیا کی طرف سے

مایوس ہو کر پنجاب کی راہ لی جہاں اُسے سکھوں اور افغانوں سے امداد کی توقع تھی۔ مگر لیک بھی برابر دریائے بیاس تک ہلکر کے تعاقب میں چلا آیا تھا اور غالباً اسی کے سر پر آپہنچنے کے رعب سے پنجاب میں شکست خوردہ ہلکر کی فوجی امداد کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوا دوسرے کارنوالس اور اس کے جانشین بارلو کی طرف سے صلح کی ایسی نرم شرائط پیش کی گئیں کہ ہلکر نے خوشی سے صلح کرلی اور اپنی ریاست میں چلا آیا (۲۶ دسمبر ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ)

دوسری فصل۔ جنگ وفتوحاتِ جنگ میں وقفہ

ولزلی کی علٰحدگی

آج کل ولزلی کو اس کے ہم وطن سلطنت ہند کے سب سے نامور بانیوں میں شمار کرتے اور بجا طور پر اپنی قوم کا محسن سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی حکومت کے زمانے میں اس کے اولوالعزمانہ منصوبوں کو انگلستان کے اہل الرائے ابتدا سے مخدوش جانتے تھے۔ صرف ولزلی اور اس کے لائق سپہ سالاروں کی پیہم فتوحات نے اُن کی زبان بند کر دی تھی مگر جب ان فتوحات کا سلسلہ رکا اور ہلکر کے مقابلے میں مونسن کو شکست ہوئی تو فوراً وزرائے انگلستان نے ولزلی کو واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا اور دوبارہ کارنوالس کو منتخب کیا جس کی صلح پسندی اور دوراندیشی پر مسٹر پٹ (وزیر اعظم) کو کامل اعتماد تھا۔

وزرا کے اس فیصلے کو سب سے زیادہ تقویت خود کمپنی کے حصہ داروں سے پہنچی جو ولزلی کے جنگی مصارف برداشت کرتے کرتے عاجز آگئے تھے۔ بے شبہہ نئی فتوحات سے کمپنی کے مقبوضات میں نمایاں اضافہ ہوا لیکن اول تو ابھی ان کی آمدنی پوری طرح وصول نہ ہوتی تھی۔ دوسرے جنگ کے خرچ نے کمپنی کے خزانے کو خالی کر دیا تھا اور کمپنی کے جز رس حصہ دار فقط سالانہ منافعہ کو دیکھتے تھے اور ان میں سے بعض کی آمدنی کا ذریعہ بھی واقعی یہی منافعہ تھا لہٰذا آئندہ فوائد کثیرہ کی امید پر وہ وقتی خسارے کی تاب نہ لا سکے اور ان کے ایک بڑے گروہ نے ولزلی کو واپس بلانے پر اصرار کیا خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے کہ ولزلی اپنے منصوبے کو کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا سکے۔ وہ انگلستان بلا لیا گیا اور انگریزوں کی کامل سیادت حاصل کرنے کے کام میں چند سال کا وقفہ پڑ گیا۔

مصالحانہ طرزِ عمل

لارڈ کارنوالس دوبارہ گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو بہت

ضعیف و علیل تھا اور چند ہفتے کے بعد ہی فوت ہو گیا (اکتوبر ۱۸۰۵ء) لیکن ونسنٹ اسمتھ کے قول کے مطابق "جب تک ہاتھ میں قلم پکڑنے کا دم باقی رہا۔ وہ برابر اپنے پیشرو (ولزلی) کے طریق عمل کو الٹنے میں مصروف رہا۔۔۔۔۔۔۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ گوالیار و گوہد، سندھیا کے حوالے کر دیئے جائیں۔ انگریزی علاقے کی سرحد دریائے جمنا قرار دی جائے اور جے پور اور دوسری راجپوت ریاستوں سے قطع تعلق کر کے مرہٹہ لیڈروں کو ان میں لوٹ مار کی بالکل آزادی دیدی جائے۔۔۔" صفحہ (۶۰۸)۔

لیک نے جو اپنی جنگی خدمات کے صلے میں "لارڈ" کے خطاب سے مشرف ہوا تھا، اس آخری طرز عمل کی بہت مخالفت کی لیکن کارنوالس نے کوئی حجت و دلیل نہ سنی اور یہ سمجھ کر اپنی رائے پر قائم رہا کہ جب مرہٹے راجپوتانے کے لڑائی جھگڑوں میں الجھے رہیں گے تو انگریزی علاقوں کو امن مل جائے گا اور کارنوالس کے بعد سر جان بارلو نے ابھی اس طریق عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ سر جان کلکتہ کی کونسل کا سب سے پرانا رکن تھا۔ کارنوالس کی وفات پر حسب قاعدہ گورنر جنرلی کا کام اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور نظمائے کمپنی نے بھی اسی کو اس عہدے پر مستقل کر دیا۔ وہ نظمائے کمپنی اور وزرائے انگلستان کا نہایت مطیع و فرماں بردار تھا اور اسی لئے کارنوالس کے مصالحانہ طرز عمل پر مضبوطی سے کاربند رہا۔ اس کی یہی "کمزوری" تھی جس کی بناء پر بعض انگریز مورخ بارلو کو ہندوستان کا سب سے "گھٹیا" (دوی مینسٹ) گورنر جنرل کہتے ہیں[1]۔ اور شاید اس بات کی بھی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے کہ ولزلی کی مسلسل جنگ و جدال کے بعد امن و امان خود کمپنی کے واسطے مفید اور ضروری تھا کہ چند سال دم لے کر کافی روپیہ اور فوج فراہم کر لے چنانچہ بارلو نے سندھیا اور ہلکر کے ساتھ نرم سے نرم شرطوں[2] پر صلح کر کے، دو ہی سال میں کمپنی کا خالی خزانہ دوبارہ بھر دیا اور حصہ داروں کو سالانہ منافع کی طرف سے بالکل مطمئن کر دیا[3]۔

---

[1] ۔ اوکس ہس صفحہ ۶۰۸۔

[2] ۔ ہلکر کے ساتھ جو صلح ہوئی اس کی قابل ذکر شرائط یہ تھیں کہ ہلکر آئندہ بندھیل کھنڈ، بوندی اور بوندی کی شمالی ریاستوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا چنبل کے جنوب میں ہلکر کے مقبوضات واپس دیدیئے جائیں گے اور کمپنی ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے گی۔ (تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۳۰۹)

[3] ۔ اس زمانے میں ہندوستان کی آمدنی میں سے خرچ کے بعد جتنا روپیہ بچتا وہ سال کے سال نظمائے کمپنی کو ولایت

باب ۲

مزید براں بارلو کی عدم مداخلت یا کمزوری جو کچھ سمجھئے صرف ہلکر کے ساتھ معاملہ کرنے میں تھی ورنہ جب نظمائے کمپنی کی طرف سے تحریک ہوئی کہ مرہٹوں کی تالیف قلوب کے لئے عہد نامہ بسین کی بعض شرائط بھی بدل دی جائیں اور پیشوا کے معاملات میں، جو انگریزوں کی سیاوت سے اب بہت ناخوش نظر آتا تھا، دخل کم کر دیا جائے تو بارلو نے شدت سے مخالفت کی اور اپنے حقوق مداخلت میں ذرا بھی کمی کرنی پسند نہ کی[۱]

ویلور کا فساد

بارلو کے عہد کا ایک اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ویلور (احاطہ مدراس) کے ہندوستانی سپاہی بگڑ گئے اور انھوں نے اچانک قلعے پر حملہ کیا جہاں ٹیپو سلطان کے بیٹے گورہ فوج کی حراست میں تھے۔ گوروں کو شکست ہوئی اور وہ اور تمام انگریز افسر مارے گئے باغیوں کا قلعے پر قبضہ ہو گیا۔ لیکن بہت جلد ارکاٹ کی انگریزی سپاہ پہنچ گئی اور اس نے باغی سپاہیوں کو گرفتار کر لیا جنھیں سخت عبرتناک سزائیں دی گئیں ٹیپو سلطان کے بیٹوں کی اس فساد میں کوئی شرکت ثابت نہ ہو سکی۔ تاہم انھیں یہاں سے ہٹا کر کلکتے بھیج دیا گیا۔

انگریزی تواریخ کی عام روایت کے بموجب سپاہیوں کے بگڑنے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ انھی دنوں احاطہ مدراس کے فوجی محکمے نے ایک نئی وردی ہوائی تھی اور سپاہیوں کو ڈاڑھی مونچھ کی تراش خراش کے متعلق بھی بعض احکام صادر کئے تھے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ ماتھے پر تلک وغیرہ لگانے کی ممانعت کر دی تھی ان باتوں سے ہندوستانی سپاہی ناراض ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ انگریز ہمارا مذہب خراب کرنا چاہتے ہیں۔ اسی زمانے میں عیسائی پادری بھی ملک کے ہر حصے خاص کر مدراس و بنگال میں پھیلتے جاتے تھے۔ غرض انھی اسباب نے آخر کار سپاہیوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ نظمائے کمپنی کو جب واقعات کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی حکومت مدراس سے ناخوش ہوئے اور وہاں کے گورنر اور فوجی سپہ سالار کو عہدے سے برطرف کر دیا۔ نیز بارلو کی جگہ لارڈ منٹو (اول) کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا جو بہت پختہ کار و موقع شناس آدمی تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- بھیج دیا جاتا تھا۔ (کین جلد اول ۳۴۶ - وغیرہ)

[۱] - اوکس ص ۶۰۹ - اسی طرح حیدرآباد و اودھ کے معاملات میں اس نے مداخلت کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا اور "معاہدہ معاونت" کی ایک ایک شرط کی سختی سے پابندی کرائی۔ (دیکھو کین جلد اول ۳۲۰)

باب۲
لارڈ منٹو

نئے گورنر جنرل کے جولائی ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں عنانِ انتظام ہاتھ میں لینے کے کچھ عرصے بعد ریاست ٹراونکور میں انگریزوں کے خلاف وہ ہنگامہ ہوا جس نے ویلور غدر کی طرح ایک مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے انگریز ریزیڈنٹ کی ریاست کے معاملات میں مداخلت' فساد کی اصلی بنا تھی اور اسی مداخلت نے ریاست کے دیوان ویلو تامپی کو اس قدر مشتعل کیا کہ آخر اس نے بہت سے بلوائیوں کے ساتھ ریزیڈنٹ کی قیام گاہ پر حملہ کیا اور گو ریزیڈنٹ بال بال بچ کر نکل گیا لیکن تیس گورہ سپاہی بلوائیوں کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے بعد میں یہ فساد بہت جلد رفع دفع کر دیا گیا لیکن قرینہ کہتا ہے کہ چند سال کے بعد پارلیمنٹ میں جو بحث چھڑی کہ پادریوں کو ہندوستان میں دینِ مسیحی کی تبلیغ کے واسطے جانے کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے' اس میں زیادہ شدت انھی ویلور و ٹراونکور کے مفسدات سے پیدا ہوئی تھی۔ مگر آخر میں قرار پایا کہ تصدیق نامے (لائسنس) کے ساتھ پادریوں کو ہندوستان آنے کی اجازت دی جائے اور سرکاری طور پر ہندوستان میں ایک بشپ اور چند ماتحت پادریوں کا تقرر بھی منظور کر لیا گیا جن کی تنخواہیں ہندوستان کے خزانے سے ادا کی جاتی تھیں۔

ممالک غیر سے معاملت

ہندوستان کے اندرونی معاملات کا جہاں تک تعلق ہے لارڈ منٹو کے عہد حکومت کا اور کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں نظر آتا۔ خود بھی اس کو سب سے زیادہ انہماک اس میں تھا کہ ممالک ایشیا سے فرانسیسی قوم کا اثر زائل کر دے جو ابھی تک نپولین کے ماتحت اہل انگلستان سے برسر جنگ تھے۔ اسی غرض سے ایران اور سندھ و کابل کو لارڈ منٹو نے سفارتیں روانہ کی تھیں مگر سندھ کے سوا اور کہیں انگریزی سفیروں کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ جب اس رو سے ستلج کے جنوب کی سکھ ریاستوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سیادت قبول کرنے پر انگریزوں کی سیادت قبول کرنے کو ترجیح دی تو لارڈ منٹو نے خوشی سے ان کے تحفظ کا ذمہ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ سے یہ عہد و پیمان لے لیا کہ وہ آئندہ ان ریاستوں کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے گا۔ (عہد نامہ امرتسر ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۳ھ)

اسی زمانے میں بحرِ ہند میں فرانسیسیوں کے خلاف جو مہم انگلستان سے بھیجی گئی اس میں بھی لارڈ منٹو نے نمایاں حصہ لیا۔ افریقہ کے مشرق میں اکثر جزائر پر

باب ۲

اہلِ فرانس کا قبضہ تھا اور لڑائی کے زمانے میں وہ وہاں سے نکل نکل کر انگریزوں کے تجارتی جہازوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح اُن دنوں مجمع الجزائر شرق الہند کے کئی جزیرے حکومت فرانس کے زیرِ نگیں تھے اور ولندیز آبادکاروں کی حیثیت محکومانہ رہ گئی تھی۔ اُن پر حملے کے وقت خود منٹو جزیرۂ جاوا کی لڑائیوں میں شریک تھا اور اگرچہ اہلِ فرانس نے وہاں کے شہروں کو نہایت مستحکم اور بہترین اسلحہ سے محفوظ کر رکھا تھا لیکن ہندوستان کی انگریزی فوجوں کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش نہ گئی اور جزیرۂ ملکا اور جاوا انگریزوں نے فتح کر لئے (۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ) مگر یورپ میں عام صلح کے وقت جاوا کو ولندیزوں کے حوالے کر دیا گیا اور وہ آج تک اس پر قابض ہیں۔

تجارتی اجارے کی تنسیخ

منٹو کی گورنر جنرلی کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اجارے کی میعاد ختم ہوئی کمپنی کے حصہ دار و حامی اس مدت میں توسیع مزید کے خواہاں تھے کہ ممالک ہند پر جو تسلط اور تجارت کا منافع انہیں حاصل ہے اس میں کوئی فرق نہ آئے۔ لیکن انگلستان کے بعض اہل الرائے کمپنی کی ملکی حکومت اور تجارتی اجارے دونوں کے خلاف تھے اور اس کو اہلِ ہند و برطانیہ کے حق میں نہایت مضر ثابت کرتے تھے۔ خود وزیر اعظم (لارڈ گرن وِل) کا منشا تھا کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات براہِ راست حکومت انگلستان کے ماتحت کر لئے جائیں مگر اہلِ انگلستان کی تجارت پسند طبائع کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ نے حکومت کی ذمہ داریاں لینے سے تو انکار کر دیا البتہ ہندوستان میں کمپنی کو تجارت کا جو اجارہ حاصل تھا اس کی تنسیخ کر دی اور آئندہ سے ہر انگریز تاجر کو ممالک ہند میں بطور خود تجارت کرنے کا حق مل گیا۔

تیسری فصل منصوبۂ سیادت کی تکمیل

مارکوئیس اوف ہیسٹنگز

ارل اوف موئرا، جو ہندوستان کی جنگی خدمات کے صلے میں مارکوئس اوف ہیسٹنگز کا خطاب پاکر تاریخوں میں اسی خطاب سے مشہور ہے، جوانی میں انگلستان کا ایک بنام امیر زادہ تھا اور جب انسٹھ برس کی عمر میں کمپنی کے ہندی مقبوضات کا گورنر جنرل مقرر ہوا (۱۸۱۳ء مطابق ۱۲۲۸ھ) تو بقول مورخ ونسنٹ اسمتھ اس بات کی کوئی امید نہ تھی کہ وہ آخر میں ہندوستان کے سب سے نامور گورنر جنرلوں میں شمار ہوگا۔

اور یہ ناموری محض اتفاقی واقعات کا نتیجہ نہیں بلکہ درحقیقت ہیسٹنگز کی عمدہ انتظامی قابلیت جنگی مستعدی اور مشقت پسندی کا واجبی صلہ ہو گی" وہ کبھی گرمیوں میں پہاڑوں پر جا کر نہیں رہا۔ بایں ہمہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ علی الصباح چار بجے لکھنے کی میز پر نہ آگیا ہو"[۱] مگر ہیسٹنگز کے ذاتی حالات میں اس جگہ سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ ہندوستان کے متعلق اس کے سیاسی منصوبے بہت کچھ ولزلی کی مثل تھے اور ابتداہی سے وہ ارادہ کر چکا تھا کہ "اگر علانیہ نہیں تو اندرونی طور پر عملاً انگریزی حکومت کی ہند میں سیادت قائم کر دی جائے[۲]"

جنگ نیپال

ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا مقصد جنگ وجدال کے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اول تو ہندوستان کی بعض بڑی بڑی ریاستوں میں گو قوت نہ رہی تھی۔ پھر بھی قدیم خود مختاری کی آن بان باقی تھی۔ دوسرے شمال میں پنجاب و نیپال کے علاقے جو ہمیشہ سے ملک ہند میں داخل سمجھے جاتے ہیں، انگریزی کمپنی کے دائرۂ اثر میں ابھی تک بالکل نہ آئے تھے۔ انھی میں سے ایک ریاست یعنی نیپال کے ساتھ ہیسٹنگز کی پہلی لڑائی ہوئی۔

لڑائی کی تفصیلی وجوہ کسی قدر مشتبہ ہیں مگر اصلی اور بنا کا سبب یہ ہے کہ جب ولزلی نے والی اودھ سے اس کے بہت سے اضلاع لے لئے (سنہ ۱۸۰۱ء) تو ان میں گورکھپور بھی تھا جس کی حدود ریاست نیپال کے علاقۂ ترائی سے ملی ہوئی تھیں۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ایک اجنبی اور طاقتور قوم کا اس قدر قریب آجانا گورکھوں کو ناگوار گزرا ہو اور انھی کی طرف سے لڑائی کی چھیڑ چھاڑ ہوئی ہو۔ منٹو کے زمانے تک ان سرحدی تنازعات کے متعلق خط کتابت ہوتی رہی بلکہ پہلی فروری سنہ ۱۸۱۴ء (سنہ ۱۲۲۵ھ) تک خود ہیسٹنگز اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ ریاست نیپال سے جو اختلافات تھے وہ خیر و خوبی کے ساتھ طے ہو گئے[۳] لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد ہم ہیسٹنگز کو وسیع پیمانے پر جنگ کی تیاری میں مصروف پاتے ہیں۔ گویا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ بزور شمشیر

---

[۱] اوکس ہس۔ ۲۴۰۔

[۲] کین۔ جلد دوم صفحہ ۱۱۔

[۳] کین۔ جلد دوم صفحہ ۱۲۔

اہل نیپال کے دل پر کمپنی کی سطوت وقوت کا سکہ بٹھا دیا جائے ۔

مناسب ہوگا کہ اس جنگ کے حالات ہم مورخ کپن کی زبانی سنیں جو قومی طرفداری کے باوجود جنگی واقعات کو واقفیت اور سلیقے سے تحریر کرتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ دشمن کی ریاست چھوٹی سی تھی اور اس کی رعایا میں بیس لاکھ سے کچھ بہت زیادہ نفوس شامل نہ ہوں گے ۔ تاہم اس کی حدیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ کھٹمنڈو سے ملاؤن کا فاصلہ سات سو میل سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوگا ۔ اور اس تمام خط پر گورنر جنرل نے ، جو خود ہی سپہ سالار بھی تھا ۔ فوج کشی کرنے کا ارادہ کیا ۔ فوج کے اکھٹے چار جیوش (ڈویژن) سے اس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھائی کی گئی اور ان انگریزی فوجوں کو توپ و تفنگ اور یورپی فن جنگ کے مطابق ہر قسم کے ساز و سامان سے مسلح کر دیا گیا ۔ کیونکہ موئرا کا ہمیشہ کا اصول یہ تھا کہ شروع ہی سے اپنی پوری قوت کو اس مقام کے محاذ میں فراہم کر دیا جائے جس پر حملہ کرنا مقصود ہے تاکہ لڑائی کا فیصلہ جلد سے جلد ہو اور شروع میں پورا زور و زر صرف کرنے کی تلافی ہو جائے ۔ سب سے بڑے جیش میں چوبیسویں نمبر کی گورہ فوج ، چھ دیسی پلٹنیں ، ہراول (پاینیرز) اور توپچیوں کی مناسب تعداد ، غرض کل ملا کر آٹھ ہزار کی جمعیت تھی اور جنرل مارلے دیا ماریلی ، کے ماتحت گورکھوں کے دارالحکومت کھٹمنڈو پر حملہ کرنا اسی جیش کے سپرد کیا گیا تھا ۔ اس کے ساتھ تین دوسرے جیوش جنرل ووڈ گلیسپی اور اوک ٹرلونی (داختر لونی) کے ماتحت سرحد پر پیشقدمی کر رہے تھے اور ان کی ترتیب داہنی طرف سے بائیں طرف وہی تھی جو جنرلوں کے ناموں کی ترتیب سے ظاہر ہے ۔ یعنی اوک ٹرلونی بائیں طرف سب سے آخری سرے پر تھا ۔

اس زبردست حملے کو روکنے کے لئے گورکھے بارہ ہزار سے زیادہ باقاعدہ سپاہی فراہم نہ کر سکے تھے ۔ لیکن وہ بہت سے معرکے جیتے ہوئے ۔ بڑے پختہ کار و جفاکش سپاہی تھے اور انہیں امر سنہا جیسا لائق و دور اندیش سپہ سالار ملا تھا ۔ یہ شخص ذات کا "تھاپا" یعنی زراعت پیشہ لوگوں کے طبقے سے تھا اور گورکھوں کے دوسرے فوجی سردار بھی زیادہ تر اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔

کالنگا کے معرکے

انگریزی فوج کی پیشقدمی کا اوک ٹرلونی اور گلیسپی نے آغاز کیا ..... جنگ کا

جو نقشہ سوچا گیا تھا اس میں اوک ٹرلونی کا یہ تو کام تھا کہ وہ گورکھا فوج کے دائیں
جانب بڑھے جہاں خود امر سنہا تھاپا مدافعت کر رہا تھا اور ملاؤں میں اس کا جنگی مستقر تھا۔
اگر ڈیرہ دون کو لے کر مغرب کی طرف یورش کرنا اور اوک ٹرلونی کو کمک پہنچانا،
گلیسپی کے سپرد ہوا تھا۔ ڈیرہ دون میں گورکھوں کی جو جمعیت سردار بال بہادر سنہا کے
ماتحت متعین تھی تعداد و قوت میں اسے ایک چھوٹی پلٹن کے مساوی سمجھنا چاہیے۔
بال بہادر نے شہر سے کوئی چار میل شمال مشرق کی طرف ایک پہاڑی گڑھی کو اپنا
مستقر بنایا تھا جو گرد و پیش کی زمین سے تقریباً ایک ہزار فیٹ بلند ہے اور اس کی
پہاڑی کے دامن میں موضع کالنگا واقع ہے۔ گلیسپی نے اوک ٹرلونی کی مدد کو بڑھنے سے
پہلے اس گڑھی کو تسخیر کرنا ضروری سمجھا...... اور اگر اس کے سپاہیوں کے دل میں بھی
وہی آگ ہوتی جو گلیسپی کے سینے میں بھڑک رہی تھی اور اگر ماتحت افسر اس کی قرارداد کے
مطابق مل کر اپنا اپنا فرض بجا لاتے تو گلیسپی کی تدبیر چل جاتی اور شاید جنگ چند ہفتے میں
ختم ہو جاتی لیکن ان منصوبوں کے خلاف جو کچھ ظہور میں آیا وہ یہ تھا کہ انگریزی فوج کو شدید
نقصان کے ساتھ ایسی ناکامیابی ہوئی جو سخت ذلت کے درجے تک پہنچتی تھی بہت سی
قیمتی جانوں کے ساتھ خود جنرل گلیسپی کی جان بھی اسی میں ضائع ہوئی اور جنگ کا سلسلہ
ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ بال بہادر نے انگریزوں کے تین حملے رد کیے اور ان معرکوں
میں انگریزی سپہ سالار (جنرل گلیسپی) اور اور بہت سے افسروں کے علاوہ سپاہیوں کی
اتنی بڑی تعداد کو تلوار کے گھاٹ اتارا جو اس کی مٹھی بھر گورکھا فوج سے کہیں زیادہ تھی۔
آخر کار جب گڑھی کے سامنے قلعہ شکن دبابہ لگایا گیا اور محصورین کا پانی بند کر دیا گیا تو اس
اس وقت ان جانباز پہاڑیوں نے جو شمار میں صرف ستر رہ گئے تھے۔ گڑھی خالی کر دی
(ماہ نومبر) کیونکہ اب اس میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی یہ جانباز صحیح سلامت بچ کر گڑھوال
کی پہاڑیوں میں نکل گئے۔

اس افسوسناک ناکامی سے یہی نہیں کہ مغربی جنبش کی پیشقدمی میں تاخیر واقع
ہوئی بلکہ درحقیقت اسی نے گلیسپی کی فوج کے علاوہ دوسری مشرقی فوجوں کے سرداروں
اور سپاہیوں کو بھی سخت بددل کر دیا۔ جو فوج مارلے کے ماتحت کھٹمنڈو کی طرف
چڑھائی گئی تھی۔ اس کو نہایت ہی نااہل افسر ملے تھے اور ہرچند اس جنبش کو صرف سو میل کا

فاصلہ طے کرنا تھا لیکن آگے بڑھنے کی بجائے مارلے جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا اور عذر یہ کیا کہ توپوں کی مزید تعداد آجانے کا انتظار ہے۔ اس نے اپنے آگے بڑھے ہوئے دستوں کو بھی کافی مدد نہ پہنچائی اور جنوری ۱۸۱۵ء میں گورکھا فوج نے حملہ کر کے ان میں سے بعض دستے کاٹ دیئے جن میں بہت سے سپاہیوں اور انگریز افسروں کی جانیں گئیں۔ پھر تازہ کمک آنے پر اگرچہ مارلے کی فوج کی تعداد تیرہ ہزار تک بڑھ گئی اور دشمن کی سپاہ سے قریب دس گنی ہوگئی تھی۔ بایں ہمہ مارلے نے قدم آگے نہ اٹھایا اور آخر اس قدر پست ہمتی دکھائی کہ دس فروری کو رات کے وقت تن تنہا گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے مستقر دانا پور کی طرف بھاگ آیا۔ اس کی جگہ کرنل ڈگ نے لی اور اسے ایک عارضی کامیابی بھی ہوئی یعنی کھٹمنڈو کا راستہ انگریزی فوج کے لئے صاف ہوگیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد جنرل وُڈ آپہنچا مگر اس نے بھی مارلے سے کچھ زیادہ ہمت و مستعدی نہ دکھائی۔ خلاصہ یہ کہ گرمی آنے پر یہ جیش گرمائی مقامات میں ہٹ آیا اور جنگ میں کوئی کارنمایاں انجام نہ دے سکا اسی طرح دوسرے مشرقی جیش کو جو وُڈ کے ماتحت تھا، کبھی زک پہنچیں اور وہ بھی ہٹ کر گورکھپور چلا آیا"

انگریزی افواج کی ان ناکامیوں نے، جیسا کہ گبن اور دوسرے مورخوں نے صراحت کی ہے ہندوستان میں ہر طرف انگریزوں کے خلاف شورش و فساد کے آثار پیدا کر دیئے تھے اور بہت سے انگریز اہل الرائے نیپال سے مصالحت یا جنگ موقوف کرنے کا جس طرح بھی ممکن ہو مایوسانہ مشورہ دینے لگے تھے لیکن ہیسٹنگز اپنے ارادے پر استقلال سے قائم رہا اور برسات کے ختم ہوتے ہی اس نے تازہ کمک اور ساز و سامان کے ساتھ فوج کشی کے احکام جاری کئے؛ اس مرتبہ اس کے عزم و تدبیر کی قسمت نے بھی یاوری کی۔ اور اب گارڈنر نامی ایک انگریز کے مشورے سے خطِ جنگ کے اس مغربی سرے پر نیپالیوں کے مقابلے میں حملہ کیا گیا جہاں علاقہ کماؤن کے پہاڑی باشندے نیپالی حکومت کے خلاف انگریزوں کے طرفدار بنا لئے گئے تھے۔ گارڈنر پہلے مرہٹوں کی فوج میں نوکر تھا اور اسی زمانے میں جنرل لیک نے اس کو ضلع ایٹہ میں فوجی امداد کے عوض میں ایک جاگیر دلوادی تھی گارڈنر کی تدبیر چل گئی اور ایک مرتبہ ناکامیابی کے بعد دوسری دفعہ المورا پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا جہاں کا سردار بام ساہ نہ گورکھائی قوم سے تھا

نہ اس نے اپنا فرض ادا کرنے میں کچھ زیادہ مستعدی دکھائی۔
الموڑے کی تسخیر نے گورکھا فوج کو دو حصوں میں اس بُری طرح کاٹ دیا کہ پھر وہ اپنی مغربی سرحد پر خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے اور بالائی ستلج کی طرف سے اوک ٹرلونی کی پیشقدمی کا راستہ آسان ہو گیا ہلکر کے مقابلے میں اوک ٹرلونی کا پایۂ تخت دہلی کو دلیری سے بچانے کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ نیپال کی جنگ میں بھی اسی انگریز سپہ سالار کی ہمت و قابلیت سے فتح حاصل ہوئی اور امر سنہا نے ملاؤن میں گھر کر ہتھیار ڈال دیئے (مئی ۱۸۱۵ء مطابق ۱۲۲۹ھ) اسی طرح گورکھا فوج کے کئی دستوں نے جا بجا گھر کر انگریزوں کی اطاعت اور پھر فوجی ملازمت قبول کر لی[1]۔
مذکورۂ بالا واقعات نے دربار نیپال کو انگریزوں کی شرائط صلح ماننے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اسی اثنا میں اس ریاست کو سلطنت چین کی طرف سے مدد کی امید پیدا ہوئی اور وہ سابقہ قرارداد ماننے میں لیت و لعل کرنے لگی۔ لہٰذا اوک ٹرلونی پھر اپنی فوج لے کر نیپال کے دارالحکومت پر بڑھا اور آخر کار مارچ ۱۸۱۶ء (۱۲۳۰ھ) میں عہد نامہ سگولی پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے کالی ندی کے مغرب میں گڑھوال، کماؤن اور ترائی کے کئی اضلاع نیپالیوں نے کمپنی کے حوالے کر دیئے اور کھٹمنڈو میں انگریز رزیڈنٹ کا رکھنا منظور کر لیا جسے وہ معاہدے کی سب سے سخت شرط سمجھتے تھے[1]۔

پنڈاروں کا استیصال[2]

جنگ نیپال سے فرصت پانے کے بعد مارکوئیس اوف ہیسٹنگز ہندوستان کے علاقوں میں اندرونی امن و امان اور نیز پوری طرح انگریزی سیادت قائم کرنے پر متوجہ ہوا۔ اس اندرونی امن و امان میں سب سے زیادہ خلل پنڈاروں نے ڈالا تھا جن کی تعداد کثیر وسط ہند کے علاقے تاخت و تاراج کرتی پھرتی تھی۔ اسی طرح ہلکر و سندھیا کی فوجوں نے راجپوتانے میں سخت ہنگامہ مچا رکھا تھا اور وہاں کی ریاستوں پر آئے دن یورش کرتی رہتی تھیں۔ مگر یہ بے قاعدہ فوجیں اب برائے نام "مرہٹہ" رہ گئی تھیں ورنہ ان میں زیادہ تر شمالی ہند کے مسلمان سپاہی شریک تھے اور ان میں پٹھانوں کی تعداد غالب تھی

---

[1] مذکورۂ بالا حالات جنگ کا ماخذ کین کی تاریخ جلد دوم (صفحات ۴ تا ۲۰) ہے نیز دیکھو اوکس ہسٹری صفحہ ۶۲۴ وغیرہ۔

[2] اس عنوان کی ذیل کے حالات گزیٹیر جلد دوم (صفحات ۹۵ و ۴۹۴) اور اوکسفورڈ ہسٹری (صفحات ۶۲۵ تا ۶۲۹) سے ماخوذ ہیں۔

جس کی وجہ سے اب ان سب کو عام طور پر انگریزی تاریخوں میں "پٹھان" لکھدیا ہے اسی طرح "پنڈاروں" کا لفظ بھی خاص کسی قوم یا گروہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس سے وسط ہند کے وہ لٹیرے مُراد ہیں جنھوں نے اٹھارھویں صدی عیسوی (تیرھویں ہجری) کے آغاز میں نہایت خطرناک قوت بہم پہنچائی تھی اور جن میں ہندو مسلمان ہر قوم اور قریب قریب ہر علاقے کے لوگ شامل تھے۔ درحقیقت پنڈاروں کو لوٹ مار کی مشق مرہٹوں نے کرائی تھی اور ابتدا میں یہ لٹیرے انھی کی رفاقت میں بلکہ ہدایت کے مطابق مختلف علاقے تاراج کرتے تھے۔ لیکن جب مرہٹوں کے سرگروہوں نے اپنی ترک تازی چھوڑ کر مستقل ریاستیں قائم کرلیں تو گو پنڈاروں کے بعض سرداروں کو بھی مستقل جاگیریں مل گئیں، لیکن ان کے زیادہ تر افراد ایسے تھے جن کا لوٹ مار کے سوا کوئی پیشہ ور مشغلہ نہ تھا۔ اور چونکہ ان کا نہ کوئی وطن تھا نہ صحیح معنی میں کوئی مذہب، لہٰذا ان کے اخلاق واطوار کی حالت خراب تھی اور غالباً کوئی ایسی وحشیانہ سفاکی نہ ہوگی جس کا ارتکاب کرنے میں ان کو باک ہو۔

پنڈاروں کے اصلی مامن تو مالوے کے گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں تھے مگر ان کی تاخت تاراج کا دائرہ بہت وسیع تھا اور سو سو دو دو سو سے لیکر بعض اوقات دس دس ہزار کے گروہوں میں وہ اپنے مقام سے نکل کر جدھر موقع ملتا حملہ کر کے ضلع کے ضلع پامال وخراب کرجاتے تھے۔ انگریزی تاریخوں میں امیر خاں کو بھی پنڈاروں کا سرگروہ بتایا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس گروہ میں قزاقی کی جو خصوصیات تھیں وہ امیر خاں میں نہ تھیں اس لئے پنڈاروں میں اسے شمار کرنا درست نہیں۔ پنڈاروں کے دوسرے سرگروہوں میں واصل، کریم اور چیتو مشہور ہیں اور ایک مرہٹے امباجی کا بھی جابجا نام آتا ہے جس نے جنوبی راجپوتانے میں آٹھ برس تک وہاں کے باشندوں کو لوٹا اور پریشان کیا۔

اگرچہ اب پنداروں کا مرہٹہ فوجوں سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا تھا کیونکہ اس قسم کی مرہٹہ فوجیں ہی رفتہ رفتہ غائب ہوگئی تھیں جن کے ساتھ پنڈاروں کا ہونا گویا قدرتی بات تھی تاہم وسط ہند کی بڑی بڑی مرہٹہ ریاستوں کی طرف سے پنڈاروں کو اب تک کچھ نہ کچھ مدد ملتی تھی اور چیتو علانیہ اپنے آپ کو راجہ سندھیا کا ملازم بتاتا تھا، یہی سبب ہے کہ ہیسٹنگز کو ان قزاقوں کی سرکوبی میں خاص احتیاط اور جنگی تیاریاں کرنی پڑیں اور اس نے شمال وجنوب کی طرف سے ایک لاکھ بیس ہزار انگریزی فوج میدان میں اتاری جس کے

برابر تعداد میں اس وقت تک انگریزوں کی فوج کبھی فراہم نہ ہوئی تھی ۔[۱]

مقاصد و تدابیر

یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان زبردست جنگی تیاریوں کی تہ میں دیگر مقاصد و مصالح بھی مضمر تھے کیونکہ ہیسٹنگز افواج کمپنی کی آراستگی اور فراہمی کے ساتھ ساتھ وسط ہند راجپوتانے اور دکن کی قریب قریب تمام چھوٹی بڑی ریاستوں سے خط کتابت کر رہا تھا کہ ہندوستان کے جو امیر و رئیس اب تک علیحدہ رہے ہیں وہ کمپنی کی سیادت تسلیم کر لیں اور جنھوں نے بادل ناخواستہ یہ سیادت تسلیم کی ہے ان کو اور زیادہ کمزور یا کم سے کم مرعوب کر دیا جائے۔ ان تدابیر میں خاصی کامیابی ہوئی۔ بھوپال، اودے پور، جودھپور اور کوٹہ کے رئیسوں نے کمپنی کی سیادت اور دوستی کو قبول کر لیا (۱۸۱۷ء) باجی راؤ پیشوا اپنے پہلے "عہد معاونت" سے کچھ خوش نہ تھا۔ اس موقع پر اس سے بھی دبا کر کوکن کا علاقہ اور اُن حقوق سے دست برداری لے لی گئی جو بحیثیت پیشوا باجی راؤ کو دوسرے مرہٹہ رئیسوں پر حاصل تھے۔ (عہد نامہ پونا ۱۸۱۷ء)۔ اس واقعے نے باجی راؤ کو انگریزوں کا سخت مخالف بنا دیا اور وہ بھونسلا راجہ کے ساتھ ملکر انگریزوں کی محکومی سے آزادی حاصل کرنے کا درپردہ ساز باز کرنے لگا۔

سندھیا، ہلکر اور امیر خاں سے انگریزوں کے نامہ و پیام جاری تھے اس لئے وہ پنڈاروں کی کوئی مدد وقت پر نہ کر سکے پھر امیر خاں کو ریاست ٹونک دے کر خوش اور مطمئن کر دیا گیا۔ اور پنڈاروں کے باقی جتھوں کو انگریزی افواج نے گھیر گھیر کر جا بجا گرفتار یا ہلاک کیا۔

انگریزی مورخوں کا بیان ہے کہ چند مہینے کے اندر ان خوفناک قزاقوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ ان کے تین مشہور سرغنوں میں سے کریم نے انگریزوں کی اطاعت اور ضلع بستی میں ایک جاگیر لینی قبول کر لی واصل خودکشی کر کے مرا اور چیتو کو اسیر گڑھ کے جنگلوں میں جہاں وہ بھاگ کر چھپا تھا، شیر نے پھاڑ کھایا۔

لیکن اس اثنا میں قرائن کے مطابق، زیادہ طاقتور حریف یعنی مرہٹہ رئیسوں سے لڑائی چھڑ گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ جنگ مرہٹہ میں ان رئیسوں کی قوت انگریزوں سے

---

[۱] اس میں تیرہ ہزار کے قریب گورہ سپاہی اور تین سو توپیں تھیں۔

باب۷

شکست کھانے اور باہمی نااتفاقی کی بدولت بہت کچھ کمزور ہوگئی تھی۔ بایں ہمہ اب تک ممالک ہند میں اگر کسی کے دل میں انگریزوں سے ہمسری کا دعوی اور اپنی آزادی کا جوش باقی تھا تو وہ یہی مرہٹہ رئیس تھے۔ اس بات کو انگریز اہل الرائے خوب سمجھتے تھے اور لارڈ ہیسٹنگز کے طرز عمل میں مرہٹوں کے ساتھ جو کاوش جھلکتی ہے اس کا ایک سبب بظاہر یہی تھا کہ اب اُسے ان کی رہی سہی آزادی اور انگریزوں کے ساتھ ہمسری ناگوار گزرتی تھی۔

آخری جنگ مرہٹہ

الغرض پیشوا اور بھونسلا سے تو اس بنا پر کہ انھوں نے دھوکے سے انگریزی فوج پر حملہ کیا تھا۔ لڑائی چھیڑی اور ہلکر سے مخاصمت کا سبب یہ قرار دیا گیا کہ اس نے پنڈاروں کے سرغنوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ یہ اسباب جنگ بے بنیاد نہ تھے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ عداوت و نزاع کی اصلی بنا وہ معاہدہ (عہدنامۂ پونا) تھا جس پر باجی راؤ سے جبراً دستخط کرا لئے گئے تھے[1]۔ باقی اندور پر انگریزوں کی فوج کشی کا اصلی سبب اس ہل چل اور بدنظمی کو قرار دینا چاہیے جو کہ جسونت راؤ ہلکر کی وفات (۱۸۱۷ء) سے اس ریاست میں پیدا ہوگئی تھی۔

بہرحال، جنگ میں ہر جگہ مرہٹوں کو شکست ہوئی اور انھیں کمپنی کے سامنے جس نے دیکھتے دیکھتے ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ قوت بہم پہنچالی تھی سرنگوں ہونا پڑا۔ پیشوا باجی راؤ کو تو اس فوج نے جو خود اس کے خزانے سے تنخواہ پاتی تھی اور عہد معاونت کی رو سے انگریز افسروں کے ماتحت پونا کے قریب متعین تھی، دو شکستیں دے کر ملک سے باہر بھگا دیا اور خاندیس کے علاقوں میں مارے مارے پھرنے کے بعد آخر اُس نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی (جون ۱۸۱۸ء مطابق ۱۲۳۳ھ) ناگپور کی مرہٹہ فوجوں نے اتنا بھی استقلال نہ دکھایا اور بلوائیوں کی طرح ایک حملہ کرنے کے بعد، وہاں کے راجہ آپا صاحب اور اس کے سپاہیوں کا جوش فرو ہوگیا۔ اس کی فوج کے عرب سپاہی بطور خود کچھ روز تک مقابلہ کرتے رہے لیکن ایک منتظم قوت اور سلطنت کے مقابلے میں اس قسم کے ہنگامے کچھ دیرپا نہیں ہو سکتے۔ چند ہی ہفتے کے اندر یہاں بھی انگریزوں کو کامل غلبہ حاصل ہوگیا۔ (دسمبر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ)

[1] جب تک انگریزی فوجوں نے (جن کی تنخواہ "عہد معاونت" کی رو سے خود پیشوا کو دینی پڑتی تھی) پونا کا محاصرہ نہ کرلیا، باجی راؤ انگریزوں کے مطالبات ماننے سے انکار کرتا رہا۔ بہ الفاظ دیگر اس نے مذکورۂ بالا معاہدہ بالکل مجبور ہو کر کیا تھا (دیکھو تاریخ مرہٹہ جلد ثالث صفحہ ۳۸۵۔ نیز اوکس ہس، صفحہ ۶۲۹)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس تمام جنگ مرہٹہ میں سب سے سخت معرکہ جسونت راؤ ہلکر کی فوجوں سے پیش آیا۔ حالانکہ اس راجہ کی وفات (۱۸۰۸ء) کے بعد وہاں صحیح معنی میں کوئی ایسا ذی اقتدار شخص نہ رہا تھا جس کی سب لوگ اطاعت کرتے۔ متوفی کا متبنیٰ جانشین (ملہار راؤ) نابالغ لڑکا تھا اور اس کی جانب سے حکومت جسونت راؤ کی بیوہ رانی (تلسی بائی) کرتی تھی۔ اس جنگ کے موقع پر وہ انگریزوں سے مصالحت یا اطاعت پر مائل تھی لیکن فوج کے سرداروں نے اس کو قتل اور انگریزوں کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ انگریزی افواج سے ان کا خونریز مقابلہ مہد پور کے مقام پر ہوا (دسمبر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ) جو اجین سے کوئی بیس میل شمال میں واقع ہے آخر میں انگریزی فوج کو فتح ہوئی اور اس واقعے سے نہ صرف اندور کی ریاست بالکل قابو میں آگئی بلکہ سندھیا بھی مرعوب ہو گیا۔

اہم نتائج

اس طرح ۱۸۱۸ء (۱۲۳۳ھ) کے ختم تک نہ صرف پنڈاروں کا استیصال ہوا بلکہ تمام مرہٹہ رئیس کمپنی کے مطیع ہو گئے جس کے معنی یہ تھے کہ ممالک ہند میں سندھ و پنجاب اور نیپال و برما کے سوا کوئی طاقت ایسی نہ رہی جو انگریزوں کی سیادت کو تسلیم نہ کرتی ہو اور ان چار میں بھی جو آزاد رہیں۔ نیپال و برما صحیح معنی میں ہندوستان کے اندر داخل نہیں، اور شمالی پنجاب و سندھ بھی گزشتہ زمانے میں ہندوستان خاص کے باہر سمجھے جاتے تھے۔ بہر حال ان چار علاقوں کو چھوڑ کر ہند و دکن کے باقی سب علاقے بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریزی کمپنی کے زیر نگین آگئے۔ گویا ولزلی کے منصوبے کی ہیسٹنگز نے تکمیل کر دی۔

ان تمام معاہدات کا ذکر کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں جو اس موقع پر ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے کئے گئے تھے۔ اجمالاً صرف جنگ مرہٹہ کے یہ اہم نتائج بیان کرنے کافی ہوں گے کہ (باجی راؤ) پیشوا کو وظیفہ دے کر کانپور بھیج دیا گیا اور اس منصب کے خاتمے کے ساتھ اس کی تمام ریاست پر بہ استثنائے ضلع ستارا، انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ ستارا میں سیواجی کے قدیم خاندان کے وارث کو رئیس مان لیا گیا تھا لیکن اس ریاست کو بھی چند سال بعد لارڈ ڈلہوزی نے ضبط کر لیا جس کا حال ہم آگے پڑھیں گے۔ اسی طرح بھونسلا خاندان کے پاس صرف ناگپور کے

چند اضلاع چھوڑ کر باقی پورے علاقے پر ہیسٹنگز نے قبضہ کر لیا۔ ہلکر کی ریاست کے کئی ضلع مستقل طور پر نے لئے اور ملہار راؤ کی نابالغی کے زمانے تک باقی علاقہ بھی وہاں کے انگریز ریزیڈنٹ کے زیر حکومت رہا۔

راجپوتانے کا کوئی بڑا علاقہ ہیسٹنگز نے لینا پسند نہیں کیا مگر یہاں کی ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے ان میں کمپنی کو راجپوت ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کرنے کا حق مل گیا اور قریب قریب اسی اصول پر وسطِ ہند کی دوسری ریاستوں سے معاہدے کر لئے گئے۔ اسی ضمن میں کچھ کی ریاست کا بھی ذکر کر دینا چاہئے جہاں کے رئیس نے پہلے کمپنی سے اتحاد و دوستی کا عہد کر لیا تھا لیکن بعد میں انگریزوں کی مداخلت سے تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہوا اور ہیسٹنگز نے ایک فوج بھیجکر اُسے شکست دی۔ راجہ نے اطاعت قبول کر لی تھی مگر ہیسٹنگز نے اُسے معزول کر دیا اور اس کے صغیر سن بیٹے کی جانب سے حکومت انگریز ریزیڈنٹ کو سونپ دی ۱۸۱۹ء۔

قبضۂ سنگاپور

لارڈ ہیسٹنگز کے عہد کا ایک اور قابل ذکر واقعہ **قبضۂ سنگاپور** ہے جو ان دنوں ایک چھوٹا سا مچھیروں کا جزیرہ تھا اور اب سلطنت برطانیہ کی مشرقی تجارت اور بحری قوت کا مرکز بن گیا ہے۔ دراصل نپولین بوناپارٹ کی آخری شکست و قید کے بعد جب جاوا دوبارہ ولندیزوں کو دیا گیا (۱۸۱۶ء) تو جزائر شرق الہند اور چین و جاپان سے بحری تجارت کے تمام راستے انھیں ولندیزوں کے زیر اقتدار آ گئے اور اسی کی تلافی کے لئے ہیسٹنگز نے نظامِ کمپنی کی پسند و ناپسند کا لحاظ کئے بغیر جزیرہ مذکور پر قبضہ کر لیا اور ولندیزوں کی ناراضی کی بھی چنداں پروانہ کی۔ سنگاپور کی بعد کی ترقی اور موجودہ اہمیت ہیسٹنگز کے عمدہ انتخاب اور دور اندیشی کا بدیہی ثبوت ہے۔

مختلف واقعات

لارڈ ہیسٹنگز نے جس طرح عملاً کمپنی کی سیادت ہندوستان میں قائم کی اسی طرح وہ چاہتا تھا کہ وہ قدیم رسمیں بھی ترک کر دی جائیں جو کمپنی کی اس جدید سیادت و منزلت کے منافی تھیں۔ چنانچہ گو شاہ عالم بادشاہ کے نام کا سکہ ۱۸۳۵ء (۱۲۵۰ھ) تک ضرب ہوتا رہا لیکن خاص خاص درباری موقعوں پر کمپنی کی طرف سے جو نذریں دی جاتی تھیں۔ وہ ہیسٹنگز نے موقوف کر دیں۔ یوں بھی **شاہ عالم** کے بعد "شاہ دہلی" کی حیثیت کمپنی کے معمولی وظیفہ خوار کی سی ہوتی جاتی تھی اور "قلعہ معلی" جہاں

ایک زمانے میں ہندوستان کی قسمت کے فیصلے ہوا کرتے تھے۔ اب محض کسی امیر کی حویلی رہ گیا تھا۔

شاہ دہلی کے رسمی اعزاز کو کم کرنے کی ایک اور تدبیر یہ کی گئی کہ نواب وزیر والیٔ اودھ اور نواب نظام الملک آصفجاہ کو ہیسٹنگز نے لقب بادشاہی اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ لیکن باوفا چین قلیچ خاں کی اولاد نے ایسی عزت قبول نہ کی جس میں شکستہ حال شاہان دہلی کی اہانت کا پہلو مضمر تھا۔ البتہ والیٔ اودھ نے جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، یہ لقب اختیار کر لیا۔[1]

ہیسٹنگز کے دیگر ملکی انتظامات بھی اسی مقصد کمپنی کی حکومت کو مضبوطی سے ہندوستان میں قائم کرنا، نظر آتا ہے۔ یہ طریقہ کہ ضلع کے محصّل یا کلکٹر کو وسیع انتظامی اور فوجداری اختیارات دیدیئے جاتے ہیں ہیسٹنگز ہی نے جاری کیا تھا اور اب تک یہی طریقہ زیر عمل ہے۔ اسی طرح "رعیت واری" بند وبست کو بھی ہیسٹنگز کے زمانے میں بڑی وسعت دی گئی جس میں "زمیندار" یا "جاگیردار" کا رعیت سے واسطہ ہٹا کر سرکار براہ راست کاشتکاروں سے سرکاری لگان وصول کرتی ہے ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں رعیت سے بلا واسطہ لگان وصول کرنے کا طریقہ مدت سے رائج تھا لیکن سلطنت کی طرف سے بالعموم بڑے بڑے موروثی زمیندار دیہات کے مالک قرار دیدیئے جاتے تھے اور زمین کی پیداوار یا مالگزاری میں پہلا حق انھی زمینداروں کا ہوتا تھا۔ رعیت واری طریقے میں فائدہ یہی نظر آتا ہے کہ زمیندار کا حق بھی سرکار ہی کو مل جاتا ہے اور اس لئے وہ مالگزاری بڑھا سکتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہر کاشتکار سے وصول مال کے لئے سرکار کو ملازمین کا عملہ بڑھانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سرکاری ملازمین کاشتکاروں سے وہ ہمدردی اور ان کی مختلف ضروریات سے اتنی واقفیت نہیں رکھتے جو اُن کے مقامی اور موروثی زمینداروں کو ہو سکتی ہے اور اس کا نتیجہ عام طور پر زراعت اور اہل زراعت کے حق میں اچھا نہیں نکلتا۔ چنانچہ ہیسٹنگز کے زمانے میں جب کمپنی کے نئے مقبوضات میں رعیت واری بند وبست ہوا تو

---

[1] ۔ اوکس ہس صفحہ ۶۴۱۔

اول تو مالگزاری کی شرح بہت بڑھا چڑھا کے تشخیص کی گئی دوسرے اس کے وصول کرنے میں بعض مقامات کی رعایا پر ناگفتہ بہ سختیاں ہوئیں[۱]۔ آخر کار تقریباً تیس برس کے بعد ہیسٹنگز کی قرار دادہ شرح مالگزاری کو گھٹانا پڑا۔ پھر بھی ہندوستان کے جن صوبوں میں یہ رعیت واری طریقہ رائج ہے وہاں کے زراعت پیشہ باشندوں کی حالت بالعموم دوسرے صوبوں کے زمینداروں سے گری ہوئی ہے۔

[۱] ۔ اوکس بس صفحہ ۶۴۵ وغیرہ۔

باب ۳

مزید مقبوضات اور آغاز بادشاہی

پہلی فصل بعض اندرونی اصلاحات اور بیرونی لڑائیاں

مارکوئیس اوف ہیسٹنگز کے جانیکے بیس اکیس برس بعد تک ہندوستان میں انگریزی حکومت کو کوئی بڑی لڑائی پیش نہیں آئی۔ اور برما یا افغانستان کی جنگ بیرون ہندوستان کی لڑائیاں ہیں۔ یوں بھی اس عرصے میں ولیم بنٹنک کے سوا کوئی ایسا گورنر جنرل مقرر نہ ہوا جو اپنی قابلیت کا نقش چھوڑ جاتا۔ غرض اس زمانے کی تاریخ مختلف غیر مسلسل واقعات کا غیر دلچسپ سا مجموعہ رہ گئی ہے اور ہمیں ان واقعات کو علیحدہ علیحدہ سنہ وار بیان کر دینا ہی کافی ہوگا۔

پہلی جنگ برما

ہندوستان سے جاتے وقت (جنوری ۱۸۲۳ء مطابق ۱۲۳۸ھ) ہیسٹنگز کونسل کے سب سے پرانے رکن کو اپنا جانشین بنایا گیا اور لارڈ ایمہرسٹ کے آنے تک (اگست ۲۳ء) وہی حکومت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایمہرسٹ کے عہد حکومت (۲۳ء تا ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۳ھ) کا سب سے مشہور واقعہ پہلی "جنگ برما" ہے جو انگریزی روایتوں کے بموجب حکومت برما کی دست درازی کی وجہ سے چھڑی۔ واضح رہے کہ اراکان پر برما کے راجہ کا بہت سال پہلے قبضہ ہو چکا تھا اور اس کی سرحدیں جنوب مشرقی بنگال سے متصل تھیں لیکن چند ہی سال پہلے ریاست آسام میں خانہ جنگی ہوئی اور جب متخاصمین انگریزی امداد نہ حاصل کر سکے تو بعض نے حکومت برما سے اعانت کی درخواست کی۔ جس کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ خود اہل برما آسام پر قابض ہو گئے

(۱۸۱۷ء) اور اسی وقت سے ان کے انگریزوں کے ساتھ آے دن سرحدی جھگڑے رہنے لگے۔ لیکن جب کمپنی کو ہندوستان کی لڑائیوں سے فرصت ہوئی اور مصالحانہ گفتگو سے خاطر خواہ کام نہ چلا تو برما کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ (مارچ ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء) اور انگریزی افواج نے آسام پر بری اور جنوبی برما پر بحری حملہ کیا۔ آسام کا بری حملہ بعض ناکامیوں کے بعد کامیاب ہوا لیکن جنوبی برما کی لڑائی میں خلافِ اُمید بہت طوالت ہوئی اور شہر رنگون پر انگریزی قبضہ ہو جانے کے باوجود اہل برما استقلال و ہمت کے ساتھ حملے کرتے رہے۔ آخر اپریل ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں ان کا لایق سپہ سالار مہابندولا مارا گیا جس سے برمی فوج کی ہمت پست ہوگئی اور پھر وہ پایۂ تخت آوا پر انگریزوں کی پیشقدمی کو نہ روک سکی حملہ آور مقام ینڈبو تک بڑھ آے جہاں سے پایۂ تخت آوا صرف چار منزل دور رہ جاتا ہے اور اسی مقام پر صلح کی شرائط طے ہوئیں (عہد نامہ ینڈبو فروری ۱۸۲۶ء مطابق ۱۲۴۱ھ) حکومتِ برما نے آسام و اراکان کا ملک اور ساحل تناسرم حملہ آوروں کے حوالے کیا اور ایک کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ دینا قبول کر لیا جس کے بعد انگریزی فوجیں رنگون اور جنوبی برما سے واپس ہٹ آئیں۔

ایمہرسٹ کے عہد کا ایک اور مشہور واقعہ بھرتپور کی تسخیر ہے (۱۸۲۷ء) اس ریاست نے ہیسٹنگز ہی کے زمانے سے انگریزی سیادت قبول کر لی تھی لیکن جب راجہ کی وفات پر دہلی کے انگریزی رزیڈنٹ نے اس کے صغیر سن بیٹے کو وارث قرار دیا تو متوفی راجہ کے بھائی نے یہ قرارداد منظور نہ کی اور اپنی جانشینی کا اعلان کر دیا۔ جنگِ برما کی ابتدائی ناکامیوں اور پریشانیوں کی وجہ سے اوّل اوّل ایمہرسٹ بھرتپور پر فوج کشی کرنے کے خلاف تھا لیکن ۱۸۲۶ء میں رضامند ہو گیا اور انگریزی سپہ سالار لارڈ کومبرمیر نے بھرتپور کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزی توپوں کی گولہ باری اس مرتبہ بھی قلعے کا کچھ نہ بگاڑ سکی مگر محاصرین فصیل تک سرنگ لگانے میں کامیاب ہو گئے اور بارود بھر کے فصیل کا ایک حصہ اڑا دیا۔ پھر انگریزی فوج نے یورش کی اور قلعۂ بھرتپور تسخیر ہو گیا[1]!

[1] چونکہ لارڈ لیک کے زمانے میں اس قلعے کا محاصرہ اور انگریزی افواج کی ناکامی مشہور ہو گئی تھی لہذا اکثر انگریز اس کی تسخیر کو گذشتہ بدنامی رفع کرنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور غالباً اسی جوش و کد کا اثر تھا کہ فتح کے بعد راجہ کے

ایم ہرسٹ کا جانشین ۔ لارڈ ولیم بن ٹنک انگلستان کے شاہی خاندان سے تھا اور پہلے احاطۂ مدراس کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ مدراس میں اس کا عہد حکومت کامیاب نہیں رہا۔ لیکن غالباً خاندانی وجاہت اور خود بن ٹنک کے اصرار سے نظمائے کمپنی نے اسے گورنر جنرل بنانا منظور کر لیا اور وہ ماہِ جولائی ۱۸۲۸ء (۱۲۴۳ھ) میں دوبارہ ہندوستان بھیجا گیا۔

بن ٹنک کے اکثر ہندوستانی اہل الرّائے اور سنجیدہ انگریز مورّخ مدّاح ہیں اور اسے اہل ہند کا بہی خواہ اور محسن سمجھتے ہیں لیکن بعض انگریز مصنفوں نے اس کی مذمت کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اپنے انگریز ماتحتوں میں بھی وہ بہت غیر ہر دلعزیز تھا۔ اس ناراضی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ شوقِ جنگ و ملک گیری سے خالی تھا اور نظمائے کمپنی کی ہدایت کے مطابق ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے سے بالعموم احتراز کرتا رہا لیکن ایک اور سبب جس نے اس کے ماتحت انگریز عہدہ داروں کو ناراض کیا یہ تھا کہ بن ٹنک نے ان کی آمدنی کے بعض ذرایع (فوجی بھتّہ وغیرہ) کم کر دیئے اور ان کے کام پر سختی سے نگرانی قائم کی۔

مگر یہ مالی اصلاحات بالکفایت شعاری درحقیقت نظمائے کمپنی کی ہدایت کے مطابق عمل میں لائی گئی تھی جن کو جنگ برما نے پھر زیر بار اور پریشان کر دیا تھا۔ اسی کفایت کے ساتھ بن ٹنک نے سرکاری مداخل میں بھی مختلف اضافے کئے۔ خاص کر افیون کے تجارتی اجارے کا معاوضہ بہت بڑھا دیا اور اسی ضمن میں ہندوستانیوں کو کثرت سے سرکاری ملازمتیں دیں۔ سابق میں اکثر انگریز گورنر جنرل اہل ہند کی دیانت و قابلیت کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے لیکن بن ٹنک کو ذاتی طور پر اس قسم کا تعصب نہ تھا اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ اہل ہند کو ملازمت دینا عین دوراندیشی اور کفایت شعاری جانتا تھا کیونکہ دیسیوں کو اتنی کم تنخواہ دی جاتی تھی کہ اس مشاہرے پر اتنے کارگزار انگریزوں کا ملنا محال تھا۔

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ ۔ محلات کو بہت بے دردی سے لوٹا گیا اور قلعے کو تڑوا کے زمین کے برابر کرا دیا گیا! (دیکھو مارش مین کی تاریخ ہند ملخص، صفحہ ۳۵۶۔ اوکس ص ۶۵۳ وغیرہ۔

باب ۳

نئے مقبوضات

عدم مداخلت کی حکمت عملی پسند کرنے کے باوجود بن ٹنگ کے زمانے میں بھی کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ ہوا۔ یعنی مختلف وجوہ سے مشرقی بنگالے کی دو چھوٹی ریاستوں میں کمپنی کی عملداری قائم کردی گئی اور اسی طرح کورگ پر فوج بھیجکر اس ریاست کا الحاق کر لیا گیا (۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۴۹ھ) کہتے ہیں کہ یہاں کا راجہ نہایت ظالم خونخوار تھا اور انگریزوں سے سخت عداوت رکھتا تھا جب فہمایش سے کام نہ چلا اور لڑائی میں یہ راجہ گرفتار ہوا تو اُس کے خاندان میں اور کوئی مرد نہ تھا جسے جانشین بنایا جاتا۔ لہذا یہ ریاست ضبط کر لی گئی۔

ستی اور ٹھگی کا انسداد

لیکن ولیم بن ٹنگ کا سب سے مشہور کارنامہ ستی کا انسداد ہے ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ رسم بہت قدیم سے جاری تھی۔ اکبر نے اپنے عہد بادشاہی میں اُسے روکنے کی کوشش کی اور یہ قانون بنا دیا تھا کہ کسی بیوہ کو ستی ہونے پر مجبور نہ کیا جائے مگر اکبر یا دوسرے مسلمان بادشاہ ہندوؤں کی مذہبی رسوم میں مداخلت کرنا اصول حکومت کے خلاف جانتے تھے لہذا اگر کوئی بیوہ اپنے مُردہ شوہر کے ساتھ خوشی سے جلنا چاہے تو اسے نہ روکا جاتا تھا اور کمپنی کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ خوف انگیز رسم جاری رہی بعض انگریز حکام کو اس کے انسداد کا خیال آیا بھی تو وہ عملاً کچھ نہ کر سکے اور ہندوؤں کی ناراضی کے اندیشے سے خاموش رہے۔ خود لارڈ ولیم بن ٹنگ کو عرصے تک اس قسم کا انسدادی قانون بنانے میں تامل رہا اور اُس نے خاص طور پر ہندو سپاہیوں کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ آخر جب انگریز افسروں نے اُسے اطمینان دلایا کہ ہندو سپاہیوں کے بگڑنے کا اندیشہ نہیں اور اسی طرح دوسرے عہدہ داروں نے گورنر جنرل کے خیال کی تائید کی تو اس نے وہ "آئین" (ریگولیشن) جاری کیا جو "آئین ہفدہم مجریہ ۱۸۲۹ء" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی رُو سے بیوہ عورتوں کو جلانا یا زندہ دفن کرنا جرم اور سزائے موت کا مستوجب قرار دیا گیا۔ اور اعلان عام کر دیا گیا کہ جو لوگ اس کام میں شریک ہوں گے وہ "مردم کشی" اور بعض صورتوں میں وہ "قتل انسان" کے مجرم سمجھے جائیں گے۔

یہ قانون اوّل اوّل حاطہ بنگال میں نافذ ہوا تھا بعد میں مدراس و بمبئی کی مقامی حکومتوں نے اور پھر بعض دیسی ریاستوں نے بھی اسی کو خفیف ترمیم و تغیر کے ساتھ اپنے علاقوں میں جاری کر دیا اور رفتہ رفتہ ستی کی رسم ہندوستان سے اُٹھ گئی۔ غیر آباد مقامات میں

یا درپردہ اس قسم کی کارروائی ہوتی رہی ہو تو وہ کسی شمار میں نہیں کیونکہ ستی یا ستی کی طرح دوسری خوفناک رسموں کی بعض مثالیں اب تک کبھی کبھی سننے میں آتی ہیں۔

لارڈ ولیم بن ٹنک کے عہد کا ایک اور کارنامہ "ٹھگی" کا انسداد ہے۔ جس کے متعلق انگریزوں میں عجیب عجیب افسانے مشہور تھے اور ٹھگوں کی قدامت اور ہمہ گیر قوت و اثر پر انگریزی میں مستقل کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں یہ لوگ کالی یا بھوانی یا درگا دیوی کو پوجتے تھے اور ان کا تمام ہندوستان میں جال پھیلا ہوا تھا۔ ان کے باقاعدہ "جرگے" تھے جن میں لوگوں کو پکڑنے اور گلا گھونٹنے کا کام اس فن کے خاص ماہروں کے سپرد ہوتا تھا اور باقی شرکا میں سے بعض قبر کھودنے اور بعض جاسوسی کرنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ مگر ٹھگوں کی اصلی شہرت اور کمال "گلا گھونٹنے" ہی میں تھا کہ وہ راہ گیر یا مسافرت کے قریب پہنچ کر یک بیک رومال کا پھندا گلے میں ڈالتے اور آن واحد میں آدمی کا کام تمام کر دیتے تھے۔ لوگوں کو طرح طرح کے فریب دیکر لوٹنا یا مسافروں کو راستہ بھلا کر اپنے جال میں پھانسنا ٹھگوں کا خاص ہنر تھا اور اس میں شک نہیں کہ وسطِ ہند میں ٹھگی ایک موروثی پیشہ بن گئی تھی۔ بعض انگریز عہدہ داروں کی تحریک سے ولیم بن ٹنک اس گروہ کے استیصال پر آمادہ ہوا اور اُس نے "انسداد ٹھگی اور ڈکیتی" کے نام سے ایک جداگانہ محکمہ قائم کیا جو ہمارے زمانے تک بھی قائم تھا۔ اُسے ایک قسم کی ہنگامی پولیس سمجھنا چاہیئے جس کا خاص کام ٹھگوں اور ڈکیتوں کا سراغ لگا کر گرفتار کرنا تھا اور اندازہ کیا گیا ہے کہ خود ولیم بن ٹنک کے زمانے میں اس محکمے کی کوشش سے دو ہزار کے قریب ٹھگ پکڑے گئے اور انھیں قید یا پھانسی کی سزائیں ملیں[لہ]

فرمان شاہی کی تجدید

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کا اجارہ ۱۸۱۳ء میں منسوخ ہو چکا تھا لیکن عام تجارت و حکومت کی جو اجازت ملی اس کی میعاد بھی صرف بیس سال رکھی گئی تھی اور وہ ۱۸۳۳ء (۱۲۴۸ھ) میں ختم ہوئی۔ لہذا اس سال انگلستان میں بہت بحث و مباحثہ کے بعد بیس سال کے واسطے پھر مذکورہ بالا حقوق کی تجدید کی گئی اور چونکہ اس مرتبہ چین کی تجارت کا اجارہ بھی منسوخ ہو گیا۔ لہذا اب کمپنی کی حیثیت تاجر کے بجائے متاجر کی سی رہ گئی

لہ۔ مارش مین دلمص، صفحہ ۔ ۳۷۷ ۔

جیسے خاص خاص شرائط کے ساتھ ملکی مقبوضات میں حکومت کا حق دیدیا گیا تھا مگر فرمان شاہی کی
اس تجدید کے موقع پر اصول حکومت میں چند قابل ذکر تبدیلیاں ہوئیں اور اول تو گورنر جنرل کے
اختیارات دوسرے صوبوں پر بڑھا دیے گئے دوسرے اُسے ممالک ہند کے لئے
قوانین بنانے کا بھی حق دیا گیا جو پہلے حاصل نہ تھا۔ اسی ضمن میں گورنر جنرل کی کونسل میں
شعبۂ قوانین کے واسطے ایک رُکن (لا ممبر) کا اضافہ ہوا اور اس خدمت پر سب سے
اوّل اس زمانے کا مشہور انگریز انشا پرداز میکالے مقرر ہوا۔

جدید فرمان شاہی یا پارلیمنٹ کے اس قانون کی دفعہ ۸۷ بھی بہت مشہور ہے
جس میں صاف صاف الفاظ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ممالک ہند کا "کوئی باشندہ" محض
اختلاف مذہب و قومیت یا اختلاف رنگ و نژاد و بوم کی وجہ سے کمپنی کی کسی ملازمت
یا کسی عہدے سے محروم نہ کیا جائے گا" یہی وہ اصول یا وعدہ ہے جس کی بعد کے شاہی
اعلانات میں تصدیق و تجدید ہوتی رہی اور اکثر انھی اعلانات کی بنا پر اہل ہند کے سیاسی
سرگروہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔

انگریزی تعلیم کا آغاز

مذکورۂ بالا اصول اور کاروبار حکومت کی روزافزوں ضروریات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کمپنی کی
حکومت ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا رواج دینے پر آمادہ ہوگئی تاکہ اسے انگریزی داں ملازم
آسانی سے مل سکیں۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم دینے کے بہت سے انگریز اہل الرائے
مخالف تھے اور بعض کی یہ رائے تھی کہ اگر انگریزی حکومت اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرے تو وہ
اسی قدیم طرز کی عربی اور سنسکرت علوم کی تعلیم ہو جس کا ہندوستان میں پہلے سے رواج تھا۔
اس بحث میں جرائد و کتب کے ہزاروں ورق سیاہ ہوئے اور انگلستان ہندوستان میں بڑی بڑی
موشگافیاں کی گئیں۔ لیکن یہ درحقیقت بہت کچھ محض نظری مباحث تھے اور قیاسی نتائج
نکالنے کی دھن میں اکثر بحث کرنے والے کمپنی کی عملی ضروریات کو بھول جاتے تھے۔ غرض
مخالفین کی کچھ پیش نہ گئی اور بن ٹنک کے عہد ۱۸۳۵ء میں اس انگریزی طرز تعلیم کی بنیاد پڑ گئی جو
ہمارے زمانے تک رائج ہے۔ اس کے رواج دینے میں انگریزی حکومت کو سب سے
زیادہ مدد پادریوں سے ملی۔ جو اپنے نزدیک مغربی علوم کی ترویج کو دین مسیحی کی اشاعت
کا نہایت عمدہ اور یقینی ذریعہ سمجھتے تھے۔

اوکلینڈ

لارڈ ولیم بن ٹنک ماہ مارچ ۱۸۳۵ء (۱۲۵۰ھ) میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر

ولایت چلا گیا اور ایک سال تک سر چارلس مٹکاف نے عہدہ گورنر جنرل کے فرائض انجام دئیے لیکن اخبارات کو آزادی دینے کی بدولت نظمائے کمپنی اُس سے ناخوش ہو گئے اور اس کے استعفاد دینے پر انھوں نے لارڈ اوک لینڈ کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا (مارچ ۱۸۳۶ء سنہ ۱۲۵۱ھ) جو انگلستان کے امرا میں بہت اعتدال پسند اور معاملہ فہم آدمی سمجھا جاتا تھا۔ مگر جنگِ افغانستان کی ناکامی کے باعث بعد میں نہایت بدنام ہوا۔ اور اب تک بعض انگریز مورّخ اُس کی ہجو کرتے ہیں[لے]۔

معاملات افغانستان

لیکن انصاف سے دیکھئے تو لارڈ اوک لینڈ یا ہندوستان کے انگریز حکام افغانستان کے معاملات میں مداخلت اور جنگ کے اتنے ذمہ دار نہیں جس قدر کہ انگلستان کی حکومت جو وسط ایشیا میں روس کا روز افزوں اقتدار دیکھ دیکھ کر بہت خائف ہو گئی تھی چنانچہ وزیر خارجہ کی طرف سے (نظمائے کمپنی کی معرفت) لارڈ اوک لینڈ کو ہندوستان پہنچتے ہی تحریک ہوئی تھی کہ جہاں تک ہو سکے وہ روسیوں کو دربارِ کابل میں رسوخ نہ حاصل کرنے دے اور نیز ایرانیوں کو جو ان دنوں روس کے حلیف ہو گئے تھے ہرات پر قبضہ کرنے سے تا امکان روکنے کی کوشش کرے۔

ان ہدایات کی بنا پر بعض انگریز مصنفوں نے انگلستان کے وزیر خارجہ (لارڈ پامرسٹن) پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ شاید وہ اتنا جغرافیہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ہرات و ستلج کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کی درازی کا صحیح اندازہ کر لیتا۔ اسی طرح انھوں نے اوک لینڈ کو ان ہدایات کی تعمیل پر بہت کچھ بُرا بھلا کہا ہے اور لکھا ہے اگر واقعی روسیوں کا اثر ہرات و کابل تک پہنچ جاتا تو بھی کمپنی کے مقبوضات کی سرحد اُن دنوں ستلج سے آگے نہ بڑھی تھی اور اس کے اور افغانستان کے درمیان ایک طرف پنجاب اور دوسری طرف وہ امیرانِ سندھ کی آزاد ریاستیں حائل تھیں۔ نظر براں روسیوں کی سیاسی پیشقدمی سے خوف زدہ ہو کر کابل کے معاملات میں دخل دینا خواہ مخواہ اپنے آپ کو نئی دشواریوں میں پھنسانا تھا[لے]۔

امیران سندھ کے ساتھ انگریزوں کے سیاسی تعلقات کا ذکر ہم آگے پڑھیں گے لیکن اس جگہ افغانستان کی مختصر تاریخ اور سیاسی حالت دکھانا ضروری ہے۔ احمد شاہ ابدالی

لے۔ مثلاً دیکھو اوکس ہس صفحہ ۳ ۷ و ۲ ۷ ۲۔ مارش مین ۰ ۸ ۳ وغیرہ۔
لے۔ مثلاً دیکھو اوکس ہس صفحہ ۶۷۴ وغیرہ۔ انز کی شارٹ ہسٹری آف دی برٹش انڈیا صفحہ ۲۳۷ و ۲۳۶۔

جس کا حال ہم تیسری جلد میں پڑھ کر آئے ہیں ۱۷۷۳ء میں راہی عدم ہوا تھا۔ احمد شاہ پہلا
شخص ہے جس نے افغانستان کے مختلف قبیلوں کو ملا کر ایک متحدہ سلطنت قایم کی تھی اور
موجودہ سلطنت اسی کا ورثہ ہے۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے لیکن اس کا دوسرا بیٹا تیمور شاہ
جو سلطنت کے لئے نامزد تھا باپ کا جانشین ہوا۔ تیمور اپنے باپ سے کم طاقتور نہیں تھا۔
مغرب میں بلخ تک اس کی عملداری تھی اور مشرق میں سندھ اور لاہور اس کے زیر نگین
تھے چنانچہ اس کے انتقال کے وقت سلطنت افغانستان میں کشمیر۔ لاہور۔ پشاور۔ کابل۔
بلخ قندھار۔ ملتان اور ہرات بلوچستان شامل تھے اور خراسان بھی اس کی سیادت
تسلیم کرتا تھا مگر جب ۱۷۹۳ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی
کیونکہ اس کے ۲۳ بیٹے تھے اور ان سے اکثر مختلف صوبوں کے حاکم تھے۔ زمان شاہ جو کابل کا حاکم
تھا دوسرے بھائیوں کو مغلوب کر کے سلطنت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس میں
بارک زئی قبیلے کے مشہور رہنما پاینده خاں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ پاینده خاں جس طرح
تیمور شاہ کا ہوا خواہ تھا اسی طرح زمان شاہ کا بھی ہمدرد ہوگیا اور اپنے قبیلے کی مدد سے
زمان شاہ کو بادشاہ بنادیا اور بہت سے قبیلے اس کی تائید پر جمع کردیے پنجاب تک زمان شاہ کا
اثر قائم ہوگیا چنانچہ رنجیت سنگھ اس کے ماتحت تھا۔ ۱۷۹۶ء میں اس کی اتنی طاقت بڑھ گئی کہ
نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی تقلید میں اندرون ہندوستان حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا
اور چوطرف اس کی آمد آمد کی دھوم ہونے لگی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زمان شاہ نے
لارڈ ولزلی کو جو اس وقت گورنر جنرل ہو کر آیا تھا اپنے حملے کی اطلاع دی تھی۔ لیکن یہ حملہ اس وجہ سے
نہیں ہوسکا کہ زمان شاہ کی ایرانی حکومت سے پرخاش ہوگئی اور ایرانی پیشقدمی روکنے کے لئے
اس کو پنجاب سے جانا پڑا۔ اگرچہ اس ایرانی جھڑپ کے کوئی خاص نتائج برآمد نہیں ہوئے لیکن
اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ زمان شاہ ہندوستان پر حملہ نہیں کرسکا اور اس میں انگریزی حکومت کا
بھی ہاتھ تھا کہ ایرانیوں کو زمان شاہ کا مخالف بنایا گیا تھا۔ لیکن زمان شاہ کی ایک اور بدقسمتی یہ تھی کہ
قندھار میں اس کے خلاف ایک سازش ہوگئی۔ اس سازش میں پاینده خاں بھی شریک تھا
گو سازشی مغلوب ہوگئے اور پاینده خاں قتل کردیا گیا۔ لیکن پاینده خاں کے بیٹے انتقام کے
درپے ہوگئے۔ فتح خاں بڑا بیٹا تھا اس نے زمان شاہ کے بھائی محمود مرزا کو جو خراسان میں تھا
بغاوت پر آمادہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ ۱۸۰۰ء میں زمان شاہ کو ہندوستان بھاگنا پڑا

اور لدھیانے میں اس نے سکونت اختیار کر لی۔

۱۸۰۰ء میں محمود مرزا بادشاہ ہوگیا لیکن تین سال سے زیادہ برسرِ حکومت نہیں رہ سکا۔ مذہبی اختلاف سے ایک بڑی بغاوت ہوگئی اور ۱۸۰۳ء میں اس کو ہٹا کر اُس کے بھائی شاہ شجاع کو جو پشاور کا صوبہ دار تھا بادشاہ بنایا گیا لیکن شجاع میں حکومت کرنے کی قابلیت بالکل نہ تھی۔ تمام قبیلوں کو اس نے دشمن بنالیا فتح خاں بھی اس کا مخالف ہوگیا اور محمود مرزا کے بیٹے کامران مرزا کو جو ان دنوں ہرات میں تھا بغاوت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ جب شجاع حملہ سندھ سے فارغ ہوکر انگریز سفیر الفنسٹن سے ملنے کے لئے پشاور گیا تھا کہ کابل میں بغاوت ہوگئی اور فتح خاں نے محمود مرزا کو قید سے رہا کر کے بادشاہ بنا دیا ۱۸۰۹ء۔ شاہ شجاع نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن ہار مان کر لدھیانے میں سکونت پذیر ہوگیا۔ محمود شاہ کا تخت نشین ہونا اس طرح اچھا ہوا کہ تمام اختیارات اس کے اور فتح خاں کے ہاتھ میں آگئے۔ اس لائق وزیر نے افغانستان کو طاقتور بنانے کی کوشش کی۔ اپنے تمام بھائی بند حکومت پر مقرر کئے۔ چنانچہ اس کا مشہور بھائی دوست محمد خاں جو اس کا بہت بڑا مددگار تھا سندھ اور بلوچستان کو از سر نو مغلوب کر کے ہرات پر جہاں محمود کا بھائی فیروزالدین قابض تھا حملہ آور ہوا۔ دوست محمد خاں نے ہرات پر قبضہ تو کر لیا لیکن اس تسخیر میں اس سے شاہی خاندان اور بیگمات کے ساتھ ایسی زیادتیاں ہوئیں کہ شاہی خاندان کے تمام ارکان بارک زئی قبیلے سے برافروختہ ہوگئے۔ چنانچہ اس انتقام میں محمود شاہ کے بیٹے کامران مرزا نے فتح خاں کو قتل کر دیا۔ ۱۸۱۸ء۔ یہ قتل افغانستان کے شاہی خاندان کے لئے بہت مضر ثابت ہوا۔ دوست محمد خاں اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لئے کشمیر بھاگا اور وہاں فوج جمع کر کے کابل پر حملہ آور ہوگیا۔ محمود اور کامران ہرات بھاگ گئے جہاں وہ قابض رہے اور تمام افغانستان بارک زئی قبیلے کے ہاتھ میں آگیا۔ لیکن کئی سال تک افغانستان میں سیاسی انتشار پھیلا رہا۔ کیونکہ دوست محمد کے بھائی آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ ۱۸۲۶ء میں دوست محمد خاں کو اپنا اقتدار قائم کرنے کا موقع ملا اور وہ باضابطہ بادشاہ منتخب کر لیا گیا۔ اس کے سامنے بڑی مشکلات تھیں مغرب او مشرق میں چاروں طرف دشمن گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ان حالات میں دوست محمد خاں کو انگریزوں کی دوستی اختیار کرنا ضروری تھا تاکہ وہ شاہ شجاع کی تائید نہ کریں۔ کیونکہ شجاع نے

دو مرتبہ انگریزوں اور سکھوں کی تائید سے کابل پر فوج کشیاں کی تھیں جو کامیاب نہیں ہوئیں۔
ان حالات میں وسط ایشیا کا ایک جدید خطرہ پیدا ہو گیا اور اس کے ماتحت یورپ کی دو بڑی طاقتیں یعنی روسی اور انگریز تھے۔ روسی حکومت ایشیا میں اپنی سلطنت بڑھانا چاہتی تھی چنانچہ اس غرض کے لئے اس نے ایران سے ۱۸۱۳ء میں ایک معاہدہ کر لیا جو معاہدہ "گلستان" کہلاتا ہے۔ نیز محمد شاہ قاچار جو ۱۸۳۴ء میں تخت نشین ہوا تھا روسیوں کی طرف بہت مائل تھا اور اسی میلان کی وجہ سے ایرانی دربار میں روسی اثر روز بروز بڑھنے لگا۔ اور روسی ایران کی تائید سے مشرق کی طرف پیشقدمی کرنے لگے چنانچہ ہرات پر جو ایران اور افغانستان کے درمیان ایک بڑا ناکہ تھا روسیوں کی نظر پڑنے لگی اور ۱۸۳۷ء میں روسیوں کے اشارے سے ایرانیوں نے ہرات کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ کامران مرزا اور اس کے وزیر یار محمد نے جو ہرات پر حکومت کرتے تھے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا لیکن انگریز روسیوں کی پیشقدمی سے بہت پریشان ہو گئے کیونکہ اگر روسی ہرات پر قابض ہو جاتے تو افغانستان ایران کی پیشقدمی خلاف قیاس نہیں تھی اور یہ ہندوستان کے لئے خطرناک تھی۔ حالانکہ روسی انگریزی سرحد سے ابھی بہت دور تھے اور انگریزوں کو ابھی لڑنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن لارڈ پامرسٹن جو انگلستان کے وزیر خارجہ تھے بہت پریشان تھے۔ انہوں نے لارڈ اوک لینڈ کو لکھا کہ روسی خطرے کے انسداد کے لئے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں۔ سب سے بڑی تدبیر یہ تھی کہ دوست محمد خاں کو جو اس وقت افغانستان کا والی تھا انگریزوں کا حلیف بنایا جائے تاکہ وہ روسیوں کو اپنے حدود میں نہ آنے دے۔ اور ادھر دوست محمد خاں بھی انگریزوں کی دوستی کا خواہاں تھا تاکہ اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے ہاتھ پیر مضبوط ہوں۔ چنانچہ جب لارڈ اوک لینڈ گورنر جنرل ہو کر آئے تو اس نے مبارکباد بھیجی اور سکھوں کے مقابلے میں امداد چاہی تھی۔ لیکن اوک لینڈ نے یہ کہہ کے انکار کر دیا تھا کہ ہم دیسی رئیسوں کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔ اس وقت دوست محمد خاں کے ساتھ اتحاد ضروری قرار دیا گیا تو اس غرض کے لئے ایک سفارت برنیس کی سرکردگی میں کابل روانہ کی گئی۔ دوست محمد خاں اس اتحاد کے لئے تیار تھا لیکن اس نے سکھوں کے مقابلے میں انگریزوں کی تائید طلب کی یعنی انگریز پشاور حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ انگریز اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ وہ رنجیت سنگھ کو مخالف بنانا نہیں چاہتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

۱۸۳۸ء میں برنیس کی سفارت کابل سے ناکام واپس آگئی اور افغانستان نے روسیوں سے اتحاد کر لیا جو بڑی جنگ کا باعث ہو گیا۔

اول تو روسیوں کا خطرہ ایسا قریب نہیں تھا کہ انگریز حکومت افغانستان سے ایک خطرناک جنگ مول لیتے اور اگر کوئی خطرہ تھا بھی تو ایک بڑے حلیف کے لئے رنجیت سنگھ پر دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ اور وہ انگریزی حکومت کے دباؤ سے پشاور افغان حکومت کے حوالے کر دیتا۔ اگر دوست محمد خاں کے حوالے نہیں کرتا تو اس کے بھائی سلطان محمد کے ضرور حوالے کر دیتا۔ چونکہ یہ نہیں ہوا اس لئے یہ تجویز کی گئی کہ افغانستان پر حملہ کر کے قدیم وارث تخت شاہ شجاع کو جو انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا تخت نشین کیا جائے۔

چنانچہ اوک لینڈ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے افغانستان سے آمادۂ جنگ ہو گیا۔ بعض انگریز اہل الرائے اس کی تجویزوں سے اختلاف رکھتے تھے لیکن اس نے اُن کی نصیحت نہ مانی اور شاہ شجاع اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک "اتحاد ثلاثہ" قائم کر کے دوست محمد خاں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ (اکتوبر ۱۸۳۸ء مطابق ۱۲۵۴ھ)۔

فیروز پور (پنجاب) کے جنگی مرکز سے ایک زبردست فوج درۂ بولان کے راستے افغانستان پر بھیجی گئی اور اس کی مدد کے لئے ایک دوسری انگریزی فوج ملک سندھ کے راستے بڑھی کہ قندھار پر شمالی فوج سے جا ملے؛ قریب قریب اس بات کا تمام انگریزی تاریخوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ملک سندھ سے انگریزی فوجوں کا لے جانا اس عہد و پیمان کی صریح خلاف ورزی تھی جو اسی زمانے میں بار بار امیران سندھ کے ساتھ کئے گئے تھے لیکن اوک لینڈ نے "ضرورت وقتی" کے لئے اس کھلی ہوئی بد عہدی کو جائز قرار دیا اور بمبئی کی امدادی افواج نہ صرف سندھ سے گزریں بلکہ انھوں نے امیران سندھ سے جبراً بہت سا روپیہ وصول کیا اور اُن سے زبردستی ایک نئے معاہدے پر دستخط لے لئے جس نے ان امیروں کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا۔[۱]

۱؎ ونسنٹ اسمتھ نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بجنسہ ترجمہ کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

"بمبئی کی امدادی فوج کی پیشقدمی میں ۱۸۳۲ء کے معاہدوں کی صریح خلاف ورزی مضمر تھی۔ مگر لارڈ اوک لینڈ نے اپنے سکرٹری (میک ناٹن) کی معرفت کمال دیدہ دلیری سے حیدرآباد (سندھ) کے ریزیڈنٹ کو حکم دیا کہ تم سندھ کے

اپریل ۱۸۳۹ء (اواخر ۱۲۵۴ھ) میں انگریزی فوجیں شاہ شجاع کو لئے ہوئے قندھار پہنچ گئیں۔ پہاڑی راستے اور سردی کے موسم سے سفر میں کافی مصائب و نقصانات اٹھانے پڑے لیکن دشمن سے کوئی مقابلہ نہیں ہوا اور معمولی مزاحمت کے بعد قلعۂ غزنی بھی قبضے میں آ گیا۔ دوست محمد خاں نے یہ خبر سن کر کابل کو خالی کر دیا اور ماہ اگست ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) میں شاہ شجاع اور اس کے انگریز حلیف بلا وقت پائے تخت کابل پر قابض ہو گئے۔

شاہ شجاع کو افغانستان میں پہنچانے اور دوبارہ بادشاہ بنا دینے کے بعد مصلحت اور نیز مصلحت کا مقتضا یہ تھا کہ انگریزی فوجوں کو واپس بلا لیا جائے۔ لیکن اول تو شاہ شجاع کے طاقتور حریفوں کے اندیشے سے اور پھر ایران و روس کی رقابت کے جوش میں واپسی کو ملتوی کر دیا گیا اور جس قدر زیادہ دیر تک انگریز افغانستان میں ٹھہرے اسی قدر زیادہ وہاں کے مقامی جھگڑوں میں الجھ گئے۔ اور اتنے عرصے میں افغانوں کو عام طور پر یہ یقین ہو گیا کہ شاہ شجاع کی امداد محض حیلہ ہے بلکہ خود انگریز ملکِ افغانستان پر تسلط کرنا چاہتے ہیں۔

بعض انگریز عہدہ داروں کی بدچلنی[۱] سے بھی اہلِ کابل کو سخت اشتعال پیدا ہوا اور ادھر سال بھر کے بعد انگریزوں نے افغانی قبائل کو وہ روپیہ دینا موقوف کر دیا جسے

بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ ۔۔۔ امیروں کو اطلاع دے دو کہ جب تک ہماری موجودہ ضرورتیں باقی رہیں گی، اس وقت تک معاہدے کی وہ دفعہ جس میں دریائے سندھ کی راہ جنگی ساز و سامان بھیجنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ لازمی طور پر معطل رکھی جائے گی تا آنکہ وہ مہم سر ہو جائے جو خود اسی معاہدے کے کرنے والوں کی دوامی حفاظت کے واسطے (کابل) روانہ کی گئی ہے۔"

"اسی طرح واثق عہد و پیمان کے خلاف شکارپور، بھکر اور سندھ کے کئی اور مقامات پر انگریزی فوج نے قبضہ بھی کر لیا خود امیروں پر انگریزوں سے عداوت اور عہد شکنی کے الزامات وارد کئے گئے جو محض لایعنی تھے۔ پھر ان سے فروری ۱۸۳۹ء میں ایک نام نہاد معاہدے پر جبراً دستخط لئے گئے جس نے ان کی آزادی کو فنا کر دیا انہیں ایک امدادی فوج رکھنے اور اس کے لئے تین لاکھ روپیہ سالانہ دینے اور اپنے ہاں کمپنی کا سکہ چلانے پر مجبور کیا گیا اور طرح طرح سے اُن سے روپیہ وصول کیا گیا اور بہت سی زیادتیاں ہوئیں مگر اس ناخوشگوار مضمون کو مزید طول دینا بیکار ہوگا۔ (اوکس ہس صفحہ ۱۰۰)

یہاں اتنی صراحت اور کر دینی چاہیے کہ انگریزوں کی شمالی فوج کا راستہ بھی پنجاب سے گزرتا تھا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اسے گوارا نہ کیا اور اس پر زور نہ چل سکتا تھا کہ سندھ کی طرح پنجاب کے مقامات پر بھی "جنگی ضروریات" کی خاطر قبضہ کر لیا جاتا۔

[۱] اوکس ہس صفحہ ۰۰-۶۸۔ مارشمین صفحہ ۴۰۲۔

یہ قبائل اپنی غیر جانبداری کا واجبی معاوضہ سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۰ء (اواخر ۱۲۵۶ھ) میں جابجا انگریزوں کے خلاف شورشیں بپا ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ اس شورش نے ایک ایسی قومی جنگ کی صورت اختیار کر لی جس سے ممالکِ ایشیا میں اہلِ یورپ کو غالباً پہلے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ نظمائے کمپنی کو ولایت میں ان حالات کی اطلاع ہوئی تو وہ پریشان ہو گئے اور انہوں نے گورنر جنرل کو مشورہ دیا کہ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی ناکامیابی کو تسلیم کر لیں اور افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس چلے آئیں، مگر اوک لینڈ نے ان کی صلاح نہ مانی[1] اور اس کے کابل میں ٹھیرے رہنے کے ارادے کو غالباً سب سے زیادہ تقویت اس بات سے پہنچی کہ امیر دوست محمد خاں نے کچھ عرصے تک اِدھر اُدھر پھرنے اور چند لڑائیاں لڑنے کے بعد اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا (نومبر ۱۸۴۰ء) انگریزوں نے اس کے ساتھ بہت عزت کا سلوک کیا اور کلکتے بھیجکر دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

انگریزی فوج کی تباہی

لیکن دوست محمد خاں کی مصالحت یا اطاعت سے افغانوں کی عداوت میں کوئی کمی نہ آئی اور ہر طرف انگریزوں کے خلاف شورش و جنگ کا بازار گرم ہو گیا۔ انگریزی فوجوں نے اس مخالفت کو جتنا بزورِ شمشیر فرو کرنا چاہا اسی قدر اہلِ افغانستان کی ناراضی بڑھتی گئی اور بچہ بچہ انگریزوں کا دشمن ہو گیا۔ انگریزی فوج کی کل تعداد جو اس وقت افغانستان میں مقیم تھی پچیس ہزار کے قریب بتائی گئی ہے[2] اس کا سب سے بڑا حصہ خاص پائے تخت کابل میں فروکش تھا اور آٹھ دس ہزار سپاہی غزنی، جلال آباد، قندھار وغیرہ مرکزی قلعوں میں متعین کر دیے گئے تھے۔ ابتدا میں سب سے زیادہ تکلیف اور پریشانی انھی بیرونی فوجوں کو پیش آئی اور اپنے اپنے قلعوں میں ان کی حالت محصورین کی سی ہو گئی لیکن رفتہ رفتہ دشمن کی سب سے بڑی تعداد نے کابل کو گھیر لیا اور اسی شہر کے قریب ایک بڑے معرکے میں انگریزی فوج کو سخت شکست ہوئی اور وہ بہ مشکل بھاگ کر اپنے مورچوں تک سلامت پہنچ سکی[3] (نومبر ۱۸۴۱ء مطابق ۱۲۵۷ھ)

---

[1] اوکس ہس صفحہ ۶۸۰ ۔

[2] مارش مین صفحہ ۴۰۶ ۔

[3] مارش مین ۔ ۴۱۱ ۔

اس واقعے نے افغانوں کے حوصلے بڑھا دیے اور انگریزی فوج کے سپاہیوں کی ہمت کو اور بھی پست کر دیا۔ انھیں چھاؤنی سے نکلکر شہر تک جانا دشوار ہو گیا اور خود اہل شہر کی عداوت نے انگریزی لشکر گاہ میں اجناس خوردنی کا قحط ڈال دیا۔ اس وقت دشمن کے جتھے میں دوست محمد خاں کے فرزند محمد اکبر خاں کے آجانے سے انگریزوں کو ایک حد تک ڈھارس ہوئی کیونکہ یہ نوجوان سردار مصالحت پر آمادہ تھا اور اکثر افغانی قبائل کے لوگ بھی اس کے مطیع اور فرماں بردار تھے، الغرض انگریز سپہ سالاروں کو صلح کر لینا ہی بہت غنیمت معلوم ہوا جس کی شرطیں یہ تھیں کہ جلال آباد، کابل، قندھار و غزنی کو انگریزی فوجیں فوراً خالی کر دیں گی دوست محمد خاں اور اس کے خاندان کو واپس کابل بھیجدیا جائے گا اور شاہ شجاع بادشاہی کے دعوے سے دست بردار ہو جائے گا مگر اس کو اجازت ہوگی کہ خواہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان چلا جائے خواہ وظیفہ لے کر کابل میں رہے۔[۵۱]

لیکن ادھر تو قابو یافتہ افغان بعض نئے مطالبات پیش کر رہے تھے کہ انھیں غزنی اور جلال آباد وغیرہ کے تخلیئے کا اطمینان ہو جائے اور ادھر انگریز سفیر میک نارٹن بعض افغانی قبائل سے درپردہ سلسلہ جنبانی کر رہا تھا کہ اگر وہ شاہ شجاع کی رفاقت پر آمادہ ہوں تو مذکورۂ بالا صلح کو منسوخ کر دیا جائے۔[۵۲] لیکن اس کوشش میں کوئی کامیابی کی صورت پیدا نہ ہوئی تھی کہ محمد اکبر خاں نے ملاقات کے حیلے سے میک نارٹن کو بلا کر قتل کر دیا اور انگریز سرداروں کو افغانوں کے تازہ مطالبات بھی طوعاً و کرہاً تسلیم کرنے پڑے یعنی چند یرغمال اور چھ توپوں کے سوا، پورا توپ خانہ، تمام بندوقیں اور گولہ باروت افغانوں کے حوالے کر کے وہ جنوری ۱۸۴۲ء (ذی قعدہ ۱۲۵۷ھ) میں کابل سے پشاور روانہ ہو گئے، اس وقت انگریزی فوج کی تعداد پانچہزار سے بھی کم رہ گئی تھی اور اسی کے ساتھ گیارہ بارہ ہزار بھیر کے آدمی تھے۔ اپنے تمام مطالبات تسلیم کرا لینے کے بعد بظاہر اکبر خاں اور اس کے بارک زئی سردار بھی اس شکستہ دل انگریزی فوج کی واپسی میں کوئی خاص رکاوٹ ڈالنی نہ چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے سارے ملک کو اپنا دشمن بنا لیا تھا اور ان میں سب سے زیادہ خونخوار غلزئی قبائل کے لوگ تھے جن کے ساتھ

۵۱۔ مارش مین۔ ۴۱۲۔

۵۲۔ مارش مین۔ ۴۱۴۔

انگریزوں نے ابتدا میں کسی قدر بدسلوکی کی تھی[۹۵] اِن بے رحم و بے وفا قبائل کو انتقام کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ انھوں نے کابل سے تھوڑے ہی فاصلے پر خورد کابل کے تنگ درے میں انگریزی فوج پر حملہ کیا جس میں ہزاروں سپاہی اور ساتھ کے آدمی مارے گئے مختصر یہ کہ چند ہی منزل کے سفر میں انگریزی سپاہ کو برف باری۔ فاقہ کشی اور ان پیہم حملوں نے بالکل تباہ کر دیا اور ان عورتوں بچوں یا انگریز سرداروں کے سوا، جو بطور یرغمال اکبر خاں کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ ساری فوج ہلاک ہو گئی فقط ایک شخص ڈاکٹر برائیڈن زندہ بچ کر جلال آباد پہنچ سکا جس نے اس خوفناک تباہی کی اطلاع دی؛

تلافی کی تدابیر

مذکورۂ بالا نقصانات کی خبروں نے ہندوستان اور انگلستان میں تہلکہ سا ڈال دیا۔ بے شبہہ کابل میں شکست اور اس آخری مصیبت کا ایک بڑا سبب وہاں کے انگریز سپہ سالاروں کی نااہلی اور باہمی نااتفاقی تھی لیکن اکثر انگریز اہل الرّاے اس تمام خرابی کا ذمہ دار لارڈ اوک لینڈ کو قرار دیتے تھے جس نے فتح کابل کا "مجنونانہ منصوبہ" سوچا تھا۔ چنانچہ اس کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور فروری ۱۸۴۲ء میں لارڈ ایلن برو اس کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا جس نے سب سے پہلے کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے گذشتہ ہزیمت کی تلافی کی جائے۔

واضح رہے کہ کابل میں انگریزی فوج کی شکست اور مذکورۂ بالا شرائط صلح قبول کرنیکے باوجود، جلال آباد و غزنی وغیرہ مقامات کی انگریزی فوجوں نے اپنے قلعے خالی نہیں کئے تھے۔ چند روز بعد غزنی کے انگریز سپہ سالار کو ہتیار رکھدینے پڑے۔ لیکن جلال آباد، قندھار اور قلات غلزئی کی متعینہ افواج برابر مدافعت کرتی رہیں اور الن برو نے سب سے پہلے انھی کو کمک بھیجکر دشمن کے محاصرے سے نجات دلائی۔ یہ گورنر جنرل امدادی فوج کی مزید پیش قدمی سے اندیشہ مند تھا لیکن اس تازہ دم لشکر کو جو کافی ساز و سامان کے ساتھ ہندوستان سے بھیجا گیا، پولک اور ناٹ جیسے پرجوش سپہ سالار ملے تھے۔ وہ اپنی ذمّہ داری پر غزنی اور کابل تک بڑھے اور اہل افغانستان کی دشمنی کی سزا میں شہر غزنی کو جلا کر مسمار کرا دیا۔ افغانوں کی طرف سے ان کی کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی اور کابل تک پہنچ کر انگریزی فوجیں اس بھڑوں کے چھتّے کی

۹۵۔ مارش مین۔ صفحہ ۴۰۷۔

باب ۳

حدود سے واپس پشاور چلی آئیں (نومبر ۱۸۴۲ء[1]) کمپنی کی طرف سے لارڈ الن برو نے گذشتہ غلطی (یعنی افغانستان پر فوج کشی) کا اعتراف کیا اور دوست محمد خاں کو دوبارہ اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی، جہاں وہ اپنی طویل زندگی کے باقی ایام میں بلا خرخشہ حکومت کرتا رہا۔

الحاق سندھ

اگرچہ لارڈ الن برو متعدد تحریروں میں اپنی صلح پسندی کا گویا بانگ دُہل اعلان کرتا رہا تھا اور اسی زمانے میں ایک "تمغائے امن و صلح" بھی اس نے ضرب کرایا تھا[2] لیکن ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ملک سندھ پر قبضہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ چنانچہ "لارڈ اوک لینڈ نے تو صرف دیدہ دلیری سے امیران سندھ کے ساتھ بدعہدی کی تھی۔ الن برو نے اس سے بھی بڑھکر یہ کام کیا کہ عمداً انھیں جنگ کا اشتعال دلایا تاکہ اس ملک کا الحاق کیا جا سکے......"[3]

سندھ کے یہ "امیر" یا "میر" تالپور خاندان کے بلوچی سردار تھے اور ان کی تین شاخیں ہوگئی تھیں۔ ایک شاخ یا خاندان شمالی سندھ میں حکومت کرتا تھا، اور اس کا صدر مقام خیرپور تھا، شکارپور، سکھر وغیرہ بارونق تجارتی شہر اس کے علاقے میں تھے۔ دوسرا خاندان سندھ کے مشرقی اضلاع کا، اور تیسرا سندھ کے وسطی اور جنوبی علاقوں کا حاکم تھا۔ اس تیسری شاخ کا پائے تخت حیدرآباد (سندھ) اور جنگی قوت و اقتدار سب سے زیادہ تھا۔ لیکن آپس میں ان امیران سندھ کے درمیان کیسے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں، بیرونی حریف کے مقابلے میں وہ ایک ہو جاتے تھے اور کم سے کم اس بارے میں سندھ کے تمام اہل الرائے متفق تھے کہ جہاں تک ہو سکے سندھ میں انگریزوں کو کسی قسم کی مداخلت کا موقع نہ دیا جائے، حتیٰ کہ وہ کمپنی کے ساتھ کوئی تجارتی تعلق بھی رکھنا نہ چاہتے تھے

[1] اس واپسی کے متعلق مارش مین لکھتا ہے کہ "مہم کا مقصد پورا ہوگیا یعنی افغانستان کو ہم نے دوبارہ فتح کرلیا۔ اپنے قیدی چھڑا لئے اور ہماری جنگی شہرت میں پھر وہی آب و تاب آگئی، بایں ہمہ (واپس ہوتے وقت) پائے تخت کابل میں اپنے انتقام کی یادگار چھوڑنی ضرور تھی۔ لہٰذا وہاں کے بڑے مسقف بازار کو جس میں انگریزی سفیر (سر ولیم میک ناٹن) کی نعش کی تشہیر کی گئی تھی اور جو وسط ایشیا میں اپنی قسم کی سب سے شاندار عمارت تھی، سرنگ لگا کر اڑا دیا" (صفحہ ۴۲۹)

[2] مارش مین صفحہ ۴۳۱۔

[3] اوکس ہس صفحہ ۶۸۴۔

اور جب تجارتی معاہدات کرنے پر بہت مجبور کیا گیا تو اس وقت بھی انھوں نے ہر عہد نامے میں خاص طور پر صراحت کے ساتھ یہ شرط لکھوائی کہ فریقین ایک دوسرے کے ملکی مقبوضات پر لالچ کی نظر تک نہ ڈالیں گے[lh] بایں ہمہ جنگ افغانستان کے موقع پر سندھ کے بعض مقامات پر جس طرح زبردستی قبضہ کیا گیا اور خراج گزاری کے اقرار لئے گئے ان کا اجمالاً ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اب الن برو نے سر چارلس نپیئر کو کمپنی کا نمایندہ بنا کر سندھ روانہ کیا جو اس ملک کا الحاق کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ اس نے اہل سندھ کو اس قدر دق کیا کہ بمصداق تنگ آمد بجنگ آمد بلوچیوں نے بگڑ کر کرنل اوٹرم کی قیام گاہ پر حملہ کیا۔ اس مفسدے سے نپیئر کو حسب دلخواہ حیلہ مل گیا۔ اور اس نے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا[lh] (فروری ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ)

کمپنی کی قواعد داں افواج اور توپ و تفنگ کا مقابلہ کرنے کی امیران سندھ میں قوت نہ تھی۔ دو ہی لڑائیوں میں ان کا شیرازہ بکھر گیا اور پھر چند روز کی تگ و دو میں وہ قبول اطاعت پر مجبور ہو گئے مگر نپیئر نے ان "امیروں" کو جلاوطن کر کے سندھ کے الحاق کا اعلان کر دیا اور سوائے ریاست خیر پور کے، جہاں کا رئیس لڑائی میں انگریزوں کا معاون رہا تھا۔ یہ تمام علاقہ براہ راست کمپنی کے زیر نگین آگیا۔

الن برو کی بازطلبی

الن برو کے مختصر عہد حکومت کے دو واقعے اور قابل ذکر ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس نے دو لڑائیوں یعنی جنگ مہاراج پور و پنیھار میں ریاست گوالیار کی جنگی قوت توڑ دی جو وہاں کی بیوہ رانی تارا بائی اور اس کے متبنیٰ بیٹے کے صغرسن اور گوالیار کے سرداروں کی نا اتفاقی سے بہت اندیشہ ناک نظر آنے لگی تھی[lh] دوسرے اسی سال (۱۸۴۳ء) مطابق ۱۲۵۸-۵۹ھ الن برو نے بردہ فروشی کو خلاف قانون قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ آیندہ کوئی شخص کمپنی کے علاقے میں "غلام" نہیں بنایا جا سکے گا۔ اسی زمانے میں بنگال و مدراس کی ہندوستانی

لھ ۔ اوکس ہس ۔ صفحہ ۶۶۱ ۔

لھ ۔ اوکس ہس ۔ صفحہ ۶۸۵ ۔

لھ ۔ مذکورہ بالا لڑائیوں میں فتح حاصل کرنے کے بعد رانی کو وظیفہ دیکر معاملات ملکی سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ راجہ کی نابالغی تک تمام اختیارات انگریز ریزیڈنٹ کے تفویض ہوئے اور ریاست کی فوج گھٹا کر وہاں انگریزی کنٹن جنٹ کی تعداد بڑھا دی گئی۔

افواج میں شورش ہوئی اور نظمائے کمپنی نے جو الن برو کی نمائش پسندی اور خودداری سے پہلے ہی سخت شاکی تھے، اُسے واپس بلا لیا۔ (جولائی ۱۸۴۴ء مطابق ۱۲۶۰ھ)۔

دوسری فصل۔ جنگ ہائے پنجاب اور نئے مقبوضات

لارڈ ہارڈنگ (اوّل)

ایلن برو کا جانشین۔ سر ہنری ہارڈنگ جسے بعد میں "لارڈ" کا خطاب حاصل ہوا انگلستان کے نامی گرامی شرفا میں۔ یورپ کی کئی لڑائیوں میں اس نے سپہ گری کے جوہر دکھائے اور زخم کھائے تھے۔ سالہا سال تک وہ پارلیمنٹ کا رکن اور ایک مرتبہ وزارتِ جنگ کے معزز عہدے پر ممتاز رہ چکا تھا اور اگرچہ ہندوستان آنے کے وقت اُس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن سپاہیانہ جوش اور جفاکشی میں زیادہ فرق نہ آیا تھا اور اس کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی کمپنی کے اندرونی انتظامات میں تازہ قوت پیدا ہوگئی۔

لارڈ ہارڈنگ کے اوائل عہد میں دختر کشی اور انسانی قربانی یا بھینٹ کی قبیح رسموں کا جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں جاری تھیں سختی سے انسداد کیا گیا۔ ریلوں کے اجرا اور نہر کاوی کے نقشے تیار ہوئے لیکن اس گورنر جنرل کا اصلی اور مشہور کارنامہ "پہلی جنگ پنجاب" ہے جس میں سکھوں کی قوت ٹوٹی اور ملک پنجاب میں انگریزوں کا اثر قائم ہوگیا۔

جنگ پنجاب

عام انگریزی روایات کے بموجب اس جنگ کی ابتدا سکھوں کی طرف سے ہوئی جن کی فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۴ھ) کے بعد حکومت کے قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ خود حکومت (پنجاب) کی کمزوری اور ابتری اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ گذشتہ چھ برس کے اندر چار شخص گدی پر بیٹھے اور چاروں خونیوں کے ہاتھ سے مارے گئے اور رنجیت سنگھ کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ گدی نشین ہوا تھا لیکن اس میں حکومت کی صلاحیت نہیں تھی چنانچہ اس کا ہونہار بیٹا نونہال سنگھ حکومت کرتا تھا۔ یہ باپ بیٹے بہت دنوں تک حکومت نہیں کر سکے۔ کھڑک سنگھ اس کا بیٹا نونہال سنگھ دونوں ۱۸۴۰ء میں ایک ہی دن مر گئے ان کے مرنے کے بعد گدی نشینی کا مسئلہ زیر بحث ہوگیا۔ رنجیت سنگھ کا ایک اور بیٹا شیر سنگھ ۱۸۴۱ء میں گدی نشین ہوگیا کیونکہ فوج اس کی تائید کرتی تھی لیکن پنجاب کے اور عمائد اس کے ہمدرد نہیں تھے اور جب شیر سنگھ نے

زبردستیاں شروع کیں تو سب اس کے مخالف ہو گئے چنانچہ ایک سکھ سردار اجیت سنگھ نے ۱۸۴۳ء میں شیر سنگھ کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے مرنے کے بعد رنجیت سنگھ کے ایک اور بیٹے کو جس کا نام دلیپ سنگھ ہے اور جو اس وقت بہت چھوٹا تھا گدی نشین کر دیا گیا اور اس کی ماں رانی جنداں متولی حکومت بنائی گئی۔ یہ رانی بھی کوئی خاص لیاقت یا خاندانی وجاہت نہ رکھتی تھی اور ظاہر تھا کہ سکھوں کی مثل شورہ پشت سپاہیوں پر اس کا کوئی حقیقی رعب داب نہ ہو سکتا تھا بلکہ درحقیقت یہ ان سپاہیوں کی عنایت تھی کہ انھوں نے جنداں کے صغیر سن بچے دلیپ سنگھ کو رنجیت سنگھ کا بیٹا اور پنجاب کا حاکم تسلیم کر لیا۔[۱]

ان سکھ سپاہیوں کی تعداد جنھیں رنجیت سنگھ کی غیر معمولی قابلیت اور سالہا سال کی کوشش نے ایک زبردست فوج کی شکل میں مرتب کر لیا تھا، نوے ہزار کے قریب بتائی گئی ہے اور اس میں پچاس ہزار سے زیادہ پیادہ فوج کے وہ سپاہی تھے جو جدید ترین اسلحہ سے مسلح اور مغربی قواعدِ جنگ سے بخوبی واقف تھے اور اُن کے فرنگی سرداروں میں کم سے کم دو ایسے تھے جو خاص نپولین بونا پارٹ کی فوجی ملازمت اور تربیت میں رہ چکے تھے۔ اسی طرح سکھوں کے پاس بڑا زبردست توپخانہ تھا اور مجموعی طور پر اُن کی فوجی قوت ایسی اچھی تھی کہ انگریز اُن پر حملہ کرنے میں ہچکچا تے تھے۔[۲] چنانچہ اس جنگ کی پہلی تین لڑائیاں ستلج کے جنوب (یعنی انگریزی علاقے) میں ہوئیں جو دسمبر ۱۸۴۵ء وجنوری ۴۶ء مطابق ۱۲۶۱ھ)

آغاز جنگ کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ سکھوں نے دہلی کی تسخیر و تاراجی کے ارادے سے ستلج کو عبور کیا۔ رانی جنداں اور اس کے مشیروں نے بھی ان سرکش سپاہیوں کے دباؤ سے بچنے کے لئے انھیں انگریزی علاقے پر حملے کی تحریک کی یعنی ان کی تخریب و تباہی کا سامان کیا اور ان جنگجو سپاہیوں نے جن کا کوئی دور اندیش سر دھرانہ تھا، اس تجویز کو قبول کر لیا۔ پھر ستلج اتر کے لدھیانہ کے مغرب میں ان کے انگریزی فوج کے ساتھ دو یا تین خونریز معرکے ہوئے (مدکی، فیروز شاہ،

[۱] ۔ دلیپ سنگھ کے نسب اور جنداں رانی کے متعلق دیکھو گریفن کی کتاب "رنجیت سنگھ" صفحہ ۱۰۹۔ اوکس ہس صفحہ ۶۹۳۔
[۲] ۔ اوکس ہس۔ صفحہ ۶۹۳۔

باب ۵

علی وال کی لڑائیاں) جن میں ابتدائی کامیابی کے بعد آخر میں سکھوں کو شکست ہوئی اور وہ بہت نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئے۔

لیکن جنگ کا آخری معرکہ ستلج و بیاس کے سنگم کے قریب سبراؤں پر ہوا (فروری ۱۸۴۶ء) جس میں سکھوں کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی اور کچھ ان مصائب اور کچھ باہمی نفاق کی وجہ سے پھر وہ انگریزی فوج کو نہ روک سکے جس نے چند روز میں آگے بڑھ کر لاہور پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ اسی جگہ یہ شرائط صلح قرار پائیں کہ دوآبہ جالندھر اور تاوانِ جنگ کے ساتھ کشمیر و ہزارہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور لاہور میں ایک انگریز ریزیڈنٹ۔ اور ختم سال تک انگریزی فوج بھی مقیم رہے گی۔

لاہور کے قبضے اور ان شرائط کے طے کرنے میں بڑی آسانی اس لئے ہوئی کہ خود دربار لاہور کے بعض سکھ سردار انگریزوں کے رفیق و مددگار ہو گئے حتیٰ کہ انہی کی درخواست پر چند ماہ بعد مذکورہ بالا معاہدے میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ انگریزی فوج ایک سال کی بجائے آٹھ سال تک لاہور میں مقیم یا قابض رہے گی۔ نیز انگریز ریزیڈنٹ (سر ہنری لارنس) اس انتظامی مجلس کا صدر نشین بنا دیا گیا جو دلیپ سنگھ کی نابالغی کے زمانے میں حکومت کرنے کے واسطے مقرر ہوئی تھی اور لارنس کی یہ صدارت کچھ فوجی اقتدار و قوت اور کچھ ذاتی قابلیت کی بدولت ایسی حکومت بن گئی کہ راجہ اور اس کے سکھ سرداروں کا فقط نام ہی نام رہ گیا ورنہ قریب قریب سارے اختیارات انگریز ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں آ گئے۔[1]

دوسری جنگ کے اسباب

انگریزوں کا یہ تسلط یقیناً پنجاب کے بہت سے سکھوں کو ناگوار ہوا ہو گا جن کی فوج کی تعداد اگرچہ گھٹا دی گئی تھی پھر بھی شمالی اور مغربی اضلاع میں متعدد جیوش جنگی ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے۔ بایں ہمہ ان کی ناراضی کئی سال تک دبی ہوئی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ بظاہر ہر طرف امن و امان ہو گیا تھا۔ کم سے کم جب تک لارڈ ہارڈنگ اپنی میعاد پوری کر کے انگلستان گیا (۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۳ھ) اس وقت تک جنگ و جدال کے کچھ آثار نہ تھے اور ہارڈنگ نے اپنے جانشین (لارڈ ڈلہاؤزی) کو یقین دلایا تھا کہ آئندہ سات برس تک ہندوستان میں توپ چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی!

[1] اوکس ص صفحہ ۶۹۵۔

لیکن اول تو نیا گورنر جنرل کشورستانی کا بڑا حامی تھا دوسرے ملتان کے سکھ صوبہ دار کی لاہور کے ریزیڈنٹ سے مخالفت اور ابتدائی کامیابی نے بہت سے سکھ سرداروں کو انگریزوں کے خلاف آمادۂ جنگ کر دیا۔ یہ سکھ صوبہ دار مول راج نامی چند سال پہلے اپنے باپ کی جگہ ملتان کا حاکم ہوا تھا۔ اس کے متوفی باپ کی زرستانی اور دولتمندی سارے پنجاب میں مشہور تھی اور اسی بنا پر لاہور کی حکومت نے مول راج سے سند صوبہ داری کے معاوضے میں ایک کروڑ روپیہ نذرانے کا مطالبہ کیا۔ مول راج نے اس قدر کثیر روپیہ دینے سے انکار کیا اور آخر میں رانی جِنداں اور اس کے مشیر اس رقم کا صرف پانچواں حصہ (بیس لاکھ روپیہ) لینے پر رضامند ہو گئے تھے کہ اتنے میں انگریزوں سے لڑائی چھڑ گئی اور لاہور میں انگریزی ریزیڈنٹ کا عمل دخل ہو گیا۔ لیکن جب انگریز ریزیڈنٹ نے از سر نو اس معاملے کو اٹھایا اور اندرونی انتظامات میں بھی مول راج کو بعض نئی قیود و ہدایات کا پابند بنانا چاہا تو اس نے تنگ آکر استعفا دینے کی دھمکی دی۔ ریزیڈنٹ فوراً استعفا قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا بلکہ مول راج کی بجائے اُس نے اپنے ایک معتمد علیہ کھان سنگھ کو ملتان کی صوبہ داری پر نامزد کر دیا اور نئے صوبہ دار کے ساتھ دو انگریز ملتان بھیجے گئے کہ کھان سنگھ اُن کے مشورے سے صوبے کا انتظام کرے۔ ¹ (مارچ ۱۸۴۸ء)

ان انگریز مشیروں نے جائزہ لیتے وقت حساب فہمی میں مول راج سے بہت سختی کا برتاؤ کیا اور اگرچہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خود مول راج نے ان انگریزوں کو قتل کرنے کی تحریک کی لیکن جب ان انگریزوں کے ساتھ کے سکھ سپاہیوں نے بگڑ کر اپنے انگریز افسروں کو مار ڈالا تو مول راج نے قاتلوں کے اس فعل پر پسندیدگی ظاہر کی اور علانیہ انگریزوں کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ اس کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بنو اور لاہور سے جو انگریزی فوجیں آئی تھیں وہ خاطر خواہ کامیابی نہ حاصل کر سکیں اور ان فوجوں کے بہت سے سکھ سپاہی اور سردار مول راج سے مل گئے۔

¹ مارشمین صفحہ ۲۵۸۔ ونسنٹ اسمتھ نے کھان سنگھ کا نام ہی اڑا دیا ہے (صفحہ ۶۹۵) اور دیگر روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کھان سنگھ محض برائے نام صوبہ دار تھا اور نہ اصلی اختیارات انھیں دو انگریزوں میں سے ایک نوجوان عہدہ دار مسٹر اگنیو کے ہاتھ میں رکھے مقصود تھے۔

باب۳
چلیان والہ اور گجرات کے معرکے

اس بات کے بھی ثبوت پائے گئے کہ بہت سے سکھ سردار درپردہ انگریزی حکومت کے خلاف ساز باز کر رہے ہیں اور انھوں نے پشاور دے کر امیر دوست محمد خاں کو اپنا شریک و مددگار بنا لیا ہے۔ غرض ملتان کے معمولی فساد نے چند ہی مہینے میں بڑھتے بڑھتے ایک بڑی جنگ کی صورت اختیار کر لی اور ڈلہاؤزی نے بڑے طیش و غضب کے ساتھ وسیع پیمانے پر سکھوں کا قلع قمع کرنے کی تیاریاں کیں۔ نومبر ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) میں ایک بہت بڑی انگریزی فوج فیروز پور میں جمع ہوئی اور خود انگریزی سپہ سالار (لارڈ گف) اسے لیکر لاہور کے شمال میں بڑھا جہاں سکھ فوجیں سردار چتر سنگھ حاکم ہزارہ اور اس کے بہادر فرزند سردار شیر سنگھ کی ماتحتی میں اپنی قومی حکومت و آزادی کے واسطے آخری جد و جہد کرنے جمع ہوئی تھیں۔ ابتدائی آویزشوں کے بعد جنگ کا اصلی معرکہ جہلم کے کنارے چلیان والہ کے میدانوں میں ہوا جو لاہور سے تقریباً سو میل شمال مغرب میں واقع ہے (جنوری ۱۸۴۹ء مطابق ۱۲۶۴ھ) سکھ سپاہیوں کی بہادری اور جنگجوئی ہمیشہ سے مسلّم ہے لیکن اس موقع پر ان کو بہت اچھے سپہ سالار ملے اور ایک اعتبار سے لڑائی میں انھی کو کامیابی ہوئی کہ انگریزی فوجوں کو میدان سے ہٹکر قصبۂ چلیان والہ تک واپس آنا پڑا[۱] مگر اس کے تھوڑے ہی دن بعد ملتان تسخیر ہو گیا اور وہ انگریزی فوجیں جو اس شہر کے محاصرے میں

۱۔ اس لڑائی میں فریقین کا بہت نقصان ہوا اور دونوں اپنی فتح کے دعویدار تھے۔ مگر مارشمن معترف ہے کہ جنگ کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں قریب قریب شکست ہی ہوا۔ چار انگریزی توپیں اور تین انگریزی پلٹنوں کے جھنڈے غنیم نے چھین لئے۔ انگریزی (گوروں کے) رسالے کی شہرت پر (جسے قلیل التعداد سکھ رسالوں نے بہت بری طرح بھگا دیا تھا) سخت حرف آیا اور اسی مناسبت سے سکھوں کی جوانمردی کا شہرہ زیادہ ہو گیا۔ انگریزی فوج کے مقتولین و مجروحین کا شمار ۲۴۴۲ تھا اور اسی میں ۸۹ افسر شامل تھے۔ اگرچہ گورنر جنرل (ڈلہوزی) نے سرکاری طور پر اس لڑائی کو اپنی فتح بتایا اور انگریزی قلعوں سے اس کی خوشی میں سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں لیکن شیر سنگھ اس سے پہلے اور میدان جنگ ہی میں شام کے وقت اپنی فتح کی سلامی سر کر چکا تھا۔ اور ہندوستان میں بھی عام طور پر اس لڑائی کو انگریزوں کی سخت اور افسوسناک ہزیمت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح انگلستان میں جب جنگ کی اطلاع پہنچی تو برطانوی توپوں اور جھنڈوں کا چھن جانا، برطانوی رسالے کا دشمن کے سامنے سے فرار ہونا اور ایک پوری برطانوی رجمنٹ کا ہلاک ہونا ایسے واقعات تھے کہ انھیں سنکر وہاں لوگوں میں سراسیمگی اور ناراضی پیدا ہو گئی۔ ان تمام مصائب کی اصلی وجہ واجبی طور پر لارڈ گف کی بری تدابیر جنگ کو قرار دیا گیا اور ڈیوک آف ولنگٹن کے اتفاق رائے سے گف کو عہدۂ سپہ سالاری سے ہٹا کر اس کی بجائے سر چارلس نیپئر کو مقرر کیا گیا۔" صفحہ ۵۶۹)

مصروف تھیں۔ گف کی امداد کے لئے پنجاب پہنچ گئیں۔ ادھر شیر سنگھ کو رسد رسانی کی مشکلات نے اپنے مضبوط مورچے چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ لاہور کی سمت میں بڑھ رہا تھا کہ چناب عبور کرنے سے پہلے قصبۂ گجرات کے قریب انگریزی فوجوں نے اسے آلیا اور چند ہی گھنٹے کی گولہ باری میں سکھوں کی ترتیب درہم برہم کر دی اور دن ڈھلتے ڈھلتے پنجاب کی آزادی کے یہ آخری حامی اپنی سب توپیں اور جنگی ساز و سامان چھوڑ کر میدان سے فرار ہو گئے (فروری ۱۸۴۹ء مطابق ۱۲۶۴ھ) دریائے سندھ کے پار تک ایک انگریزی فوج نے شکست خوردہ سکھوں کا اور ان کے بعض افغانی مددگاروں کا تعاقب نہ چھوڑا اور چند ہی ہفتے میں اہل پنجاب کی زبردست جنگی قوت بالکل فنا ہو گئی۔

الحاق پنجاب

اس کامیابی کے بعد ڈلہوزی نے نظمائے کمپنی یا اپنی کونسل کی رائے لئے بغیر، بلا پس و پیش ملک پنجاب کے الحاق کا اعلان کر دیا (۱۸۴۹ء) اور نابالغ دلیپ سنگھ کو سالانہ وظیفے پر علیحدہ کر کے راجہ کی ذاتی جاگیرات، عمارات حتیٰ کہ زیورات پر بھی خود قبضہ کر لیا۔ انھی زیورات میں "کوہ نور" نامی مشہور ہیرا بھی تھا جو اب تاج انگلستان کی زینت ہے۔ اہل پنجاب سے اسلحہ لے کر اندرونی امن و انتظام کے لئے پولس کا ایک بہت بڑا محکمہ قائم کیا گیا اور مالی اور عدالتی صیغوں میں مفید اصلاحیں عمل میں آئیں بیرونی حملوں سے حفاظت کے لئے سرحد پر بہت سے نئے قلعے اور چھاؤنیاں بنا دی گئیں اور ایک خاص "گشتی فوج" (موبائل آرمی) مرتب کی گئی کہ وقتِ ضرورت بہ عجلت ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ جائے۔[لہ]

برما کی دوسری جنگ

ان ملکی انتظامات میں ڈلہوزی کے کئی سال صرف ہوئے اور ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں ہندوستان کے دوسرے سرے پر جو جنگ چھڑی وہ بھی ایک حد تک اتفاقی واقعات ہی کا نتیجہ تھی اور پہلے سے اس کا کوئی خاص ارادہ یا سامان نہیں کیا گیا تھا، اس جنگ کے جو اسباب انگریزی تاریخوں میں بیان کئے گئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی شکست کے باوجود برما کے راجہ کے غرور یا کم سے کم انگریزوں کے ساتھ اہانت آمیز سلوک میں چنداں فرق نہ آیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں بعض انگریز سوداگروں پر زیادتیاں ہوئیں اور ان کی طرف سے ڈلہوزی نے راجہ سے باقاعدہ شکایت اور تاوان دلانے کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے ان مراسلوں کا کوئی خاطر خواہ

لہ۔ اوکس ہیس صفحہ ۲۰۰ و ۱۰۷ زیورات کی ضبطی کے لئے دیکھو کین جلد دوم صفحہ ۲۰۱۔

باب ۳

جواب نہیں دیا تو انگریز سفیر نے اپنی حکومت سے اجازت لئے بغیر اہل برما کے ایک جہاز کو پکڑ لیا۔ برما والوں نے مزاحمت کی اور اسی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی طرف سے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا گیا (اپریل ۱۸۵۲ء ۱۲۶۸ھ)

اس لڑائی میں اہل برما انگریزی فوجوں کا کوئی قابل ذکر مقابلہ نہ کر سکے اور انگریزوں کا بلا وقت پروم تک سواحل برما پر قبضہ ہو گیا۔ بایں ہمہ راجہ نے شرائط صلح ماننے سے قطعی انکار کیا اور نظمائے کمپنی کی رائے یہ ہوئی کہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا جائے مگر ڈلہوزی نے یک بہ یک ایک غیر قوم کے اتنے وسیع علاقے کا الحاق کرنا مناسب نہیں سمجھا اور صرف جزیرہ نمائے پیگو اور ساحلی اضلاع کمپنی کے زیر نگیں کر لئے۔ جس سے ایک طرف تو سنگاپور تک خلیج بنگالہ کا پورا ساحل براہ راست انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور دوسری طرف برما کا ملک ایک چھوٹی سی ریاست رہ گیا اور اس کی دفاعی قوت محدود و کمزور ہو گئی۔

مختلف علاقوں کی ضبطی

ایک چھوٹی سی تعزیری مہم ۱۸۵۰ء میں سکم کے راجہ کے خلاف بھیجی گئی اور بعض انگریزوں کے ساتھ بدسلوکی کی سزا میں اس پہاڑی ریاست کا تھوڑا سا علاقہ چھین لیا گیا۔ اس کے سوا اور کوئی جنگی کارروائی ڈلہوزی کو نہیں کرنی پڑی۔ بایں ہمہ اس کے زمانے میں ہندوستان کے متعدد علاقے کمپنی کے قبضے میں آئے اور کئی دیسی ریاستوں پر انگریزوں کا براہ راست تصرف و تسلط قائم ہوا۔ اس قبضے کے لئے ڈلہوزی نے جو طریقہ اختیار کیا اُسے ہم اصطلاحاً قانون استقراض[1] کہیں گے یعنی جب کسی ماتحت ریاست کا رئیس لاولد فوت ہو جاتا تھا تو کمپنی ریاست کا خاتمہ کر کے اس پر خود قابض ہو جاتی تھی۔

ڈلہوزی کے مذکورہ بالا اصول پر انگلستان و ہندوستان میں بہت کچھ مباحثے ہو چکے ہیں۔ اکثر انگریز اہل الرائے اس قسم کی ضبطی کو بالکل جائز بلکہ عین مناسب بتاتے ہیں۔ اور بعض نے سخت الفاظ میں ڈلہوزی پر نکتہ چینی کی ہے کہ یہ طریقہ قزاقوں کے مناسب حال ہو تو ہو کسی سلطنت کے اربابِ حکومت کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہے[2]۔ لیکن قانونِ استقراض کے

---

[1] یعنی ڈوک ٹرن اوف لیپس (Doctrine of Lapse) جس کا "قانونِ بازگشت" کے لفظ سے بھی ترجمہ کرتے ہیں لیکن ہمیں استقراض سے بہتر کوئی مرادف نہیں مل سکا۔

[2] مثلاً دیکھو مارش مین۔ صفحہ ۱۷۴، ۷۴ وغیرہ۔

جواز وعدم جواز کی اخلاقی بحث کو چھوڑکر، اگر ہم اس کے سیاسی نتائج وعواقب پر غور کریں تو بھی ماننا پڑے گا کہ ایک غیر قوم کی رعایا میں اس قسم کے قوانین کا نفاذ دوراندیشی کے خلاف ہے۔
مگر اس طرز عمل کا صرف ڈلہوزی کو ذمہ دار قرار دینا' درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اوّل تو پہلے بھی دو ایک مرتبہ لاولد رئیسوں کی ریاستیں ضبط کی جاچکی تھیں دوسرے اوک لینڈ ہی کے زمانے میں کمپنی کا یہ اصولِ حکومت معرض تحریر میں آگیا تھا کہ "ہمارے سیاسی طریق عمل کا صاف اور واحد مقصود یہ ہونا چاہئے کہ ملکی مقبوضات اور آمدنی کے اضافے کا کوئی جائز اور مستحسن موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے البتہ جو حقوق پہلے سے واجب ہیں ان کا احتیاط کے ساتھ احترام کیا جائے" اس کے علاوہ ڈلہوزی نے جتنی ریاستیں ضبط کیں ان سب ہی سے نظمائے کمپنی بلکہ خود حکومتِ انگلستان نے منظوری دی اور تائید کی۔

الحاق ستارا، ناگپور، جھانسی وغیرہ

الغرض قانونِ استقراض کی رُو سے ڈلہوزی نے جن ریاستوں کو ضبط کیا اُن میں سب سے بڑی اور مشہور ستارا، ناگپور اور جھانسی کی ہندو ریاستیں تھیں جن کے رئیس لاولد فوت ہوئے اور اُن کے لے پالک بیٹوں یا دوسرے عزیزوں کی وراثت کا حق تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسی طرح جیت پُور (بندھیل کھنڈ) سنبھل پُور (اڑیسہ) اور بھگت وغیرہ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ڈلہوزی نے ضبط کیں اور اسی ضمن میں آخری پیشوا باجی راؤ کا جو لاولد فوت ہوگیا تھا، سالانہ وظیفہ بھی اس کے پس ماندوں کو دینا موقوف کر دیا۔ ریاست قرولی بھی قانونِ استقراض کی زد میں آگئی تھی مگر اس کی قدامت کی بنا پر نظمائے کمپنی نے اسے ضبط کرنا پسند نہیں کیا۔

اسی زمانے میں نواب عظم الدولہ یا عظیم الدولہ کا انتقال ہوا۔ (۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء) یہ نواب محمد علی خاں والئ کرناٹک کا وہی پوتا تھا جس نے عمدۃ الامرا کی وفات کے بعد خطاب نوابی لیکر حکومت وریاست سے دست برداری لکھدی تھی۔ اب اُس کا یہ رسمی خطاب اور بعض اور مراعات بھی موقوف کر دی گئیں تاہم اس خاندان کا بزرگ ابھی تک احاطۂ مدراس کے دیسی رئیسوں میں سب سے اعلیٰ شمار ہوتا ہے۔

برار واودھ

برار واودھ کے الحاق کا معاملہ جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ "عہد معاونت" کی رو سے جو امدادی فوج نواب نظام الملک کو انگریزوں کے ماتحت رکھنی پڑتی تھی

لہ۔ مارش مین صفحہ ۲،۷،۴ اوکس ہیں ۴۷،

اس کے ادائی مصارف میں اکثر تاخیر اور دشواریاں پیش آتی تھیں۔ ریاست حیدرآباد کے عام انتظامات کے متعلق بھی کمپنی کے عہدہ داروں کو بہت سی شکایتیں تھیں لیکن ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں اسی قدر مداخلت پر اکتفا کی کہ ملک برار کو ٹھیکے کے طریق پر نواب نظام الملک سے لے لیا۔ یہی ٹھیکہ ہے جو بہت عرصے بعد لارڈ کرزن کے زمانے میں "دوامی" قرار دیا گیا اور اب اگرچہ برار اعلیٰحضرت نواب نظام الملک ہی کی ملک ہے لیکن اس نئے پٹے کی رو سے سرکار عالی کو اُس کے مداخل و مصارف سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

اودھ کی بدانتظامی کی وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ بار بار شکایت کرتے رہتے تھے لیکن ۱۸۰۱ء (۱۲۱۵ھ) کے معاہدے کے بعد فوجی مصارف کے عذر پر اس ریاست کا مزید علاقہ لینے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور اگرچہ یہاں کے نام نہاد بادشاہوں کی نااہلی اور بدعنوانیاں واقعی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں لیکن رعایا پر اُن کے ظلم و جبر کرنے کا الزام کچھ زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس بات کی بھی بعض شہادتیں ملتی ہیں کہ مجموعی طور پر باشندگان اودھ کی خوش حالی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ قریب کے انگریزی اضلاع سے بہت لوگ نقل مکان کر کے ریاست اودھ میں آبسے تھے۔[1] کم سے کم عام باشندوں میں اس بات کی مطلق خواہش نہ تھی کہ شاہان اودھ کی بجائے وہاں کمپنی کی حکومت قائم ہو۔ اور جیسا کہ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے اگر واقعی ڈلہوزی کا خیال یہ تھا کہ اودھ کا الحاق وہاں کے لوگوں کے لئے موجب مسرت و شکر گزاری ہوگا۔ تو آئندہ واقعات نے اُس کی بہت بُری طرح تکذیب کی یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں عام اہل ملک نے سب سے زیادہ اودھ ہی میں انگریزوں سے عداوت و مخالفت کا اظہار کیا۔[2]

لیکن اودھ کی بادشاہی کو مٹانے کا الزام ڈلہوزی کو دینا درست نہ ہوگا۔ نظماء کمپنی کا اور حکومت انگلستان کو جو آخری مراسلات اودھ کے متعلق ڈلہوزی نے بھیجے اُن میں وہاں کی بدنظمی کی شکایات لکھنے کے ساتھ اس بات کو بھی جتایا ہے کہ شاہان اودھ کمپنی کے ساتھ ہمیشہ خیرخواہی اور وفاداری کا سلوک کرتے رہے ہیں اور انھیں بادشاہی سے محروم کرنا

[1] ملاحظہ ہو کین جلد دوم صفحہ ۱۱۹۔

[2] کین جلد دوم صفحہ ۲۰۹۔

کمپنی کی سخت ناشکری اور بے انصافی ہوگی، البتہ ڈلہوزی کی یہ رائے ضرور تھی کہ اودھ کے انتظامات براہِ راست انگریز عہدہ داروں کے حوالے کر دیے جائیں اور نظم و نسق میں بادشاہ کا کوئی دخل نہ رہے۔ ہندوستان کے انگریز حکام کا ایک اور گروہ اس کارروائی کو بھی ناجائز اور معاہدات کی صریح خلاف ورزی جانتا تھا اور اس گروہ کے نزدیک اودھ کے اندرونی معاملات میں زیادہ سے زیادہ صرف اتنی مداخلت کی جا سکتی تھی کہ وہاں کے انتظامات ریذیڈنٹ یا کسی انگریز عہدہ دار کی نگرانی میں لے لئے جائیں لیکن سرکاری ملازمین جہاں تک ممکن ہو۔ سب دیسی رہیں اور مداخل شاہی میں سے کمپنی خود ایک حبہ بھی وصول نہ کرے!

مگر وزرائے انگلستان اور نظمائے کمپنی نے اس تجویز کو نہ مانا اور ادھر بادشاہی کا خالی خطاب لے کر سلطنت انگریزوں کے حوالے کر دینے پر واجد علی شاہ رضامند نہ ہوا لہٰذا ڈلہوزی نے جبراً اُسے لکھنؤ سے ہٹا کر کلکتہ بھیجدیا اور اودھ کی "بادشاہی" کے خاتمے اور مقبوضات کمپنی میں داخل کر لئے جانے کا اعلان کرا دیا[1] (فروری ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ)۔

نئے انتظامات

اودھ کا الحاق ڈلہوزی کا آخری سیاسی کارنامہ ہے اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد وہ انگلستان واپس چلا گیا۔ لیکن اندرونی نظم و نسق میں بھی اس کی بعض اصلاحات قابل یادگار ہیں۔ وہ نہایت ذہین و جفاکش آدمی تھا اور قریب قریب ہر شعبۂ حکومت کی بذاتِ خود نگرانی رکھتا تھا۔ بعض ملکی اصلاحات کے علاوہ بنگالے میں علیحدہ ایک "نائب گورنر" کا تقرر اسی کی تجویز سے ہوا (۱۸۵۴ء) ورنہ اس وقت تک گورنر جنرل ہی بنگالے کے مقامی انتظامات کا ذمہ دار ہوتا تھا!

اسی طرح "امورِ عامّہ" کا کام فوجی عہدہ داروں سے لے کر اسے ایک مستقل ملکی محکمہ بھی ڈلہوزی ہی نے بنایا اور بڑے پیمانے پر عمارات اور سڑکوں کی تیاری کا کام شروع کیا۔ ریلوں کو ہندوستان میں سب سے پہلے جاری کرنے کا فخر بھی اسی گورنر جنرل کو حاصل ہے اور اگرچہ اس کے زمانۂ حکومت میں بمبئی سے تھانہ اور کلکتہ سے رانی گنج (کوئلے کی کان) تک فقط چند میل کی پٹری تیار ہوئی تھی لیکن ہندوستان کے بڑے بڑے مقامات تک ریل لے جانے کے نقشے ڈلہوزی کی نگرانی میں مرتب ہو گئے تھے جن کی تکمیل کچھ عرصے کے

[1] مذکورۂ بالا واقعات کے لئے دیکھو مارشمن صفحہ ۴۴۲۔ اوکس ہیس ۶۔ کمین جلد دوم ۲۰۹

بعد ہوئی۔ انھی دنوں برقی تار کی ایجاد سے اہل ہند آشنا ہوئے اور ڈاکخانے کے سرکاری محکمے کی نہایت مفید توسیع و اصلاح عمل میں آئی چنانچہ آدھ آنے کے ٹکٹ میں ہندوستان کے ہر مقام پر خط پہنچ جانے کا انتظام ڈلہوزی ہی کی حسن تدبیر کی یادگار ہے۔

تیسری فصل ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور کمپنی کی حکومت کا خاتمہ

شورش کے اسباب۔ (۱) ہندوستانی فوج میں۔

فروری ۱۸۵۶ء میں جب ڈلہوزی نے اپنے جانشین لارڈ کیننگ کو حکومت ہند کا جائزہ دیا تو آئندہ شورش و فساد کا سب مواد قریب قریب تیار تھا۔ لیکن یہ بات کہ آنے والے طوفان کی ہندوستان کے انگریز حکام کو کچھ خبر تھی خود ڈلہوزی کی رخصتی تقریروں سے ظاہر ہے اس کے علاوہ انھی دنوں حکومت انگلستان کی چین و ایران کے معاملات میں مداخلت نے جنگ و جدال کی نوبت پہنچائی تو بعض گورا فوج کے دستے ہندوستان سے باہر بھیجدیئے گئے اور اگر ونسنٹ اسمتھ کی تحقیقات صحیح ہے تو ۱۸۵۶ء کے اخیر میں ہندوستان کی گورا فوج کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی تھی[1] اور یہ واقعہ بھی انگریزی حکام کے مادۂ شورش سے بے خبر ہونے کی دلیل ہے۔

اس موقع پر یہ وضاحت کر دینی ضرور ہے کہ اس زمانے کی انگریزی افواج میں ہندوستانی سپاہیوں کا تناسب اسّی فی صدی سے بھی زیادہ تھا اور کل دو لاکھ اڑتیس ہزار سپاہیوں میں صرف اڑتیس ہزار گورے یا انگریز سپاہی تھے۔ دوسرے اُن دنوں ہندوستانی سپاہی اور سرداروں کی ذاتی وجاہت اور اعتبار و وقعت زیادہ تھی اور توپخانہ، میگزین وغیرہ کی حفاظت کے اہم کام بھی ہندیوں کے سپرد کر دیئے جاتے تھے۔

اس ہندوستانی فوج کی بددلی اور ناراضی کا ایک سبب تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اہل ملک کی انگریزوں سے عام ناخوشی اور بدگمانی کا سپاہیوں پر بھی اثر پڑتا تھا۔ دوسرے یہ سپاہی جس قدر زیادہ دور دور کی لڑائیوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اسی قدر تنخواہ یا بھتے میں

---

[1] ادکس ہس ۷۱۱۔ نیز دیکھو انز صفحہ ۳۰۲۔

اضافے کا مطالبہ کرتے تھے۔ ہندو سپاہیوں کو دور دراز ممالک۔ اور خاص کر سمندر یا دریائے سندھ کے پار جانے میں بعض مذہبی عذرات تھے لہذا جب اُن کے مذکورۂ بالا مطالبات بھی سرکار نہ مانتی تھی تو وہ بہت ناراض ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مہم کابل کے بعد سے دوسری جنگ برما کے زمانے تک۔ صرف آٹھ دس برس کے اندر چار مرتبہ اسی اضافے اور بھتے کے معاملے میں جھگڑا ہوا اور فوج کی بعض پلٹنیں علانیہ شورش و فساد پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ اسی بنا پر کےننگ نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں یہ قاعدہ بنایا کہ دکنی سپاہیوں کی طرح "آئندہ "افواج بنگالہ" میں بھرتی ہونے والے سپاہیوں سے یہ اقرار لیا جائے کہ وہ ہر جگہ جہاں سرکار بھیجے گی بلا عذر جائیں گے۔ اگرچہ ان سپاہیوں پر جو پہلے کے ملازم تھے اس اقرار کی شرط واجب نہیں کی گئی تھی تاہم اس جدید قاعدے نے انھیں بہت ناخوش کیا کیونکہ نئے بھرتی ہونے والوں میں زیادہ تر انھی سپاہیوں کی اولاد اور خاندان کے لوگ ہوتے تھے۔ اس جگہ یہ وضاحت اور کر دینی چاہئے کہ بنگالے کی فوجوں میں سکھوں اور گورکھوں کی چند نئی پلٹنوں کے سوا تقریباً تمام سپاہی "ہندوستان خاص" کے باشندے تھے۔ ان میں بھی مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ہندوؤں میں بہت سے اونچی ذات کے کھتری اور برہمن سپاہی تھے جنھیں مذہبی قیود کا سب سے زیادہ لحاظ و احساس ہوتا ہے[1]۔

(۲) عام رعایا میں

عام رعایا میں انگریزوں کے خلاف شورش و ناراضی کے اسباب بالکل دوسرے اور کہنا چاہئے کہ ایک حد تک قدرتی تھے۔ ڈلہوزی کے زمانے میں جس تیزی سے کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ ہوا اس نے اہل ہند کو سخت حیران و سراسیمہ کر دیا تھا۔ یوں بھی گذشتہ بیس تیس برس میں انگریز عہدہ داروں کے طرز عمل میں نمایاں فرق نظر آتا تھا اب کمپنی سوداگروں کی جماعت نہ تھی اور نہ اُسے "بادشاہ دہلی" کی رسمی اطاعت و نیابت کی پروا رہی تھی کیونکہ مدت سے "ممالک ہند" کا یہ نام نہاد فرمانروا محض کمپنی کا ایک مجبور و بے بس وظیفہ خوار رہ گیا تھا۔ اور ادھر انگریزوں کی قوت و سطوت میں وہ ترقی ہوئی تھی کہ انھوں نے ناگپور و ستارا کی بڑی بڑی ریاستوں کا قلم کی ایک جنبش سے خاتمہ کر دیا۔

---

[1] اوکس ص ۱۳۷ و ۱۴۷۔ انز صفحہ ۳۰۵ وغیرہ۔

شاہِ اودھ کو بھرے دربار میں اس کی معزولی کا حکم سنایا اور ایک قیدی کی طرح بے روک ٹوک لکھنؤ سے لے گئے۔ چند ہفتے کے اندر اندر سکھوں کی جنگی قوت خاک میں ملا دی۔ سندھیا کی فوج سے ہتھیار رکھوا لئے۔ غرض ہندوستان میں جس طرف انھوں نے رُخ کیا اور جو ملک لینا چاہا۔ کامیابی پائی۔ اور جو اُن کے مقابلے میں آیا وہی ناکام وسرنگوں ہوا۔

ان واقعات نے اگر انگریزوں کو بجائے خود مغرور اور ان کی نظر میں ہندیوں کو ذلیل وخوار کر دیا ہو۔ تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی؛ لارڈ کیننگ نے حکومت کا کام سنبھالتے ہی دہلی کے نام نہاد بادشاہ کو بھی سرکاری طور پر یہ اطلاع دے دی تھی، کہ یہ بادشاہی کا خطاب اور قلعۂ معلی کی سکونت اور "دربار" لگانے کی اجازت فقط آپ کے (یعنی بہادر شاہ بادشاہ کے) دم تک ہے اور آپ کے بعد اگرچہ "شہزادہ ولی عہد" کو آپ کا جانشین اور "خاندانِ تیموریہ" کا بڑا مان لیا جائے گا اور مقررہ وظیفہ بھی جاری رہے گا۔ لیکن وہ جانشین خطاب بادشاہی سے محروم ہوں گے اور "قلعۂ شاہجہانی" میں آیندہ گوروں کی فوج رہے گی[1]۔

طبقۂ امرا

شاہِ اودھ کی معزولی کے بعد ہی اس دوسری اطلاع نے ہندوستان کے لوگوں میں سناٹا سا ڈال دیا۔ طبقہ اعلیٰ کے قدامت پسند ورسم پرست "امرا" (یعنی مورونی جاگیردار) تو معلوم ہوتا ہے یہ خبریں سنکر انگریزوں سے اور بھی مرعوب ہو گئے۔ کسی ملکی یا ملی حمیت کا ان میں جذبہ نہ تھا۔ اُن کے حوصلے پست۔ دل مردہ ہو چکے تھے۔ اخلاقی اور تمدنی خرابیوں نے انھیں اس قدر ضعیف و ناکارہ کر دیا تھا کہ ذاتی اغراض ومفاد کے لئے بھی جد وجہد یا ایثار و قربانی گوارا کرنے کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔ انگریزوں کے تسلط نے سب سے زیادہ نقصان انھیں امرا کو پہنچایا تھا یہی راؤ۔ راجہ، خان و میرزا دولت وحکومت سے محروم ہوئے تھے لیکن ان کو اس نقصان کا احساس اور انقلاب سلطنت کا ارمان تھا بھی تو وہ عملاً خود کچھ کرنا نہ چاہتے تھے اور نہ اتنا بڑا کام کرنے کی درحقیقت قابلیت رکھتے تھے۔ چنانچہ آیندہ فتنہ وفساد میں اگر اس طبقے کے بعض افراد نے

[1] ۔ مارش مین صفحہ ۴۹۱ و ۴۹۰ ۔

کوئی حصہ لیا بھی تو بیہودہ جوشِ انتقام اور بے محل بہادری دکھانے کے سوا ان کے کسی کام سے وہ دور اندیشی یا وہ ارادے کی پختگی اور لوگوں پر حکومت کرنے کی لیاقت ظاہر نہیں ہوتی جو ایک ملکی رہنما یا قومی سردار کا سب سے ضروری وصف ہوا کرتا ہے۔

طبقۂ متوسط وعوام

ان "سیاسی اوصاف" کے اعتبار سے ہندوستان کے متوسط اور عام طبقے کے لوگ امرا سے بھی بدتر تھے۔ شخصی بادشاہی نے صدیوں سے عوام الناس کو ملکی معاملات سے بالکل بے دخل و بے خبر کر دیا تھا اور مساوات و آزادی کے ساتھ مل کر اپنے ملکی معاملات انجام دینے کی ان میں مطلق اہلیت نہ تھی بے شبہ ان میں رنجیت سنگھ یا حیدر علی جیسے لوگوں کا پیدا ہونا ممکن تھا لیکن ایسے شخصی اقتدار حاصل کرنے کا زمانہ گزر چکا تھا کیونکہ اب جو قوت اہلِ ہند کے مقابلے میں آئی اس کی پشت پر ایک پوری قوم کا ہاتھ تھا۔ خود ہندوستان کے عوام الناس ایک حد تک سمجھتے تھے کہ اُن کا انگریزوں سے عہدہ بر آ ہونا دشوار ہے۔ بایں ہمہ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اس بے بسی کے احساس نے اُن کو دل میں اپنے امرا سے زیادہ انگریزوں کا دشمن بنا دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ گو ملک و حکومت میں عوام کا کوئی حصہ نہ تھا لیکن کمپنی کے تسلط نے صرف ہندوستانی رئیس و راجہ ہی کو دولت و حکمرانی سے محروم نہیں کیا بلکہ جہاں اس کی حکومت پہنچی وہاں کسانوں پر مالگزاری کی سختیاں بڑھ گئیں۔ دیسی مصنوعات کا بازار سرد ہو گیا اور ہزاروں ہندوستانی پیشہ ور بے روزگار و مفلوک الحال رہ گئے۔ غرض غیر قوم سے طبعی نفرت۔ اس کی قوت کا خوف۔ اقتصادی پریشانیاں اور عام جہالت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ ہند اپنے نئے حکمرانوں سے سخت بیزار ہو گئے۔ پھر قحط و گرانی۔ وبا اور بیماری غرض ہر قسم کی مصیبت کا الزام کمپنی کے سر لگایا جانے لگا۔ انگریزوں کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی سچی افواہیں ملک میں گشت کرنے لگیں۔ اور ان میں سب سے بڑھکر اس افواہ نے لوگوں کو اشتعال دلایا کہ انگریز ہندوستانیوں کا دین بگاڑنا اور ان کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں ؛

مذہبی تعصبات

اسے انگریز عہدہ داروں کی لائق تعریف خوش اعتقادی سمجھئے یا قابلِ اعتراض نادانی، مگر یہ امر مسلم ہے کہ انہی کی مدد اور حمایت کے زور پر عیسائی پادری زیرِ نظر عہد میں ہندوستان کے ہر ضلع اور شہر میں مختلف طریقوں سے دینِ مسیحی کی تبلیغ کرنے لگے بعض بڑے عہدہ دار ان کی علانیہ سرپرستی کرتے تھے اور جنہیں خود اپنے مذہب کی اشاعت سے زیادہ دلچسپی نہ تھی

باب ۳

اُن کی "آزاد خیالی" بھی اہل ہند کے اُن مذہبی عقائد کی روادار نہ تھی جنھیں یہ انگریز اوہام باطل جانتے تھے[۱]۔ ایسے ملک میں جہاں کے عوام الناس ہر نئی چیز کو خوف و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے، جہاں فقط کوٹ پتلون پہن لینے پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا تھا، انگریز عہدہ داروں کی یہ مذہبی سرگرمی یقیناً حیرت انگیز ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ویلور، بارکپور، بریلی و مدم وغیرہ مقامات پر جو ہنگامے برپا ہوئے اُن کا بھی انگریزوں کو تجربہ تھا کہ کس طرح ایک چھوٹی سی بات اہل ہند کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر دیتی ہے۔ بایں ہمہ ماننا پڑتا ہے کہ اپنی قوت و حکومت کے زور اور نیز نئی ضروریات نے انگریز حکام کو بارہا ہندوستانیوں کی ناراضی کی طرف سے بے پروا کر دیا اور انھی بے پروائیوں کا نتیجہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں فوجی سپاہیوں کی بغاوت اور پھر عام ہنگامے کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

آغاز فساد: (۱) میرٹھ میں

شمالی ہند کے سپاہیوں کی بددلی کا ایک تازہ ترین سبب تو لارڈ ڈلہوزی کا وہ فوجی قاعدہ تھا جس کا حال ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ آئندہ ہر بھرتی ہونے والے پر یہ عہد کرنا واجب قرار دیا گیا کہ سرکار انگریزی جہاں بھیجنا چاہے گی وہاں اُسے بلا عذر جانا پڑے گا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد (جنوری ۱۸۵۷ء) ایک نئی قسم کی بندوق (اِن فیلڈ رائفل) فوجوں میں رائج کی گئی جس کے کارتوس کو پہلے چربی سے چکنا کرنا پڑتا تھا اور پھر دانت سے اس کا ایک سرا کترا جاتا تھا۔ اس چکنے کارتوس اور اُس کے بھرنے کے نئے طریقے نے ہندوستانی فوجوں میں عجیب قسم کی بدگمانی اور ناراضی پیدا کر دی اور عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ ان میں گائے اور سور کی چربی لگائی گئی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے عقائد خراب ہوں۔ انگریزی حکومت کی طرف سے ان اوہام کو دور کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اپریل کے مہینے میں سب سے اول میرٹھ کی فوج کے نوّے سپاہیوں نے نئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا۔ اور اس حکم عدولی کے جرم میں انھیں فوجی عدالت نے دس سال قید بامشقت کی سزا کا فیصلہ سنایا۔ پھر تمام فوج کو جمع کر کے ان مجرمین کی سرعام وردی اتار لی گئی اور ہتکڑیاں ڈال کر جیل خانے بھیج دیا گیا[۲] (مئی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ)۔ اس واقعے نے گویا بارود کو چنگاری دکھا دی۔ ناراض سپاہی اپنے ساتھیوں کی یہ تذلیل و رسوائی

[۱]۔ دیکھو اوکس بس صفحہ ۱۴، اور اتر صفحہ ۳۰۳۔

[۲]۔ ارش مین صفحہ ۹۲ وغیرہ

دیکھکر آپے سے باہر ہوگئے اور دوسرے دن جب اُن کے انگریز افسر گرجا میں اتوار کی نماز پڑھنے جارہے تھے، غضب ناک سپاہیوں نے ان پر حملہ کرکے قریب قریب سب کو قتل کر ڈالا اور اپنے ساتھیوں کو قید سے چھڑا لائے۔ ساتھ ہی شہر میں عام ہنگامہ برپا ہوگیا اور میرٹھ کے بازاریوں نے انگریزوں کے قتل و غارتگری میں بڑے شوق سے سپاہیوں کا ہاتھ بٹایا۔ قید خانے کھول دیئے گئے۔ انگریزوں کے بنگلے اور عمارتیں جلادی گئیں جو انگریز عورت، مرد، بوڑھا، بچہ، بلوائیوں کے ہاتھ پڑا، کمال بے رحمی سے قتل کردیا گیا۔

میرٹھ میں گورا فوج بھی موجود تھی مگر سپہ سالار کی بزدلی یا نا اہلی سے وہ مذکورہ بالا شورش و فساد کا کوئی انسداد نہ کرسکی اور بپھرے ہوئے سپاہیوں نے دہلی کی راہ لی جہاں ان کے پہنچتے پہنچتے بلوہ ہوگیا تھا اور انگریزوں کو چُن چُن کے مارا جارہا تھا۔ دہلی میں گولہ بارود کا بہت سا ذخیرہ موجود تھا اور مشہور ہے کہ جب اسے بچانا محال نظر آیا تو وہاں کے انگریز سپاہیوں نے اس ذخیرے میں آگ لگادی جس سے صدہا ہندوستانی جو میگزین پر یورش کررہے تھے اُڑ گئے اور آگ دینے والے انگریز بھی گویا اپنے ہاتھ سے خود ہلاک ہوگئے۔[1]

(۲) دیگر مقامات میں

میرٹھ کی طرح تھوڑے دن بعد "ہندوستان خاص" کی قریب قریب ہر چھاؤنی میں اسی قسم کے فساد برپا ہوگئے۔ پنجاب کے انگریز عہدہ داروں نے بڑی مستعدی اور دوراندیشی سے ہندوستانی فوجوں کے ہتھیار لے لئے اور اس میں انھیں سکھوں کی تازہ بھرتی کی ہوئی سپاہ سے بہت مدد ملی۔ یہ سکھ "ہندوستانیوں" کی اس شورش میں شریک نہیں تھے بلکہ گزشتہ پنجاب کی لڑائیوں کی وجہ سے ان میں اور ہندوستانی یعنی دوآب کے سپاہیوں میں ایک قسم کی رقابت پیدا ہوگئی تھی۔ غرض سکھوں نے اور صدہا نے پنجاب کے

---

[1] اس روایت کو بعض انگریزی کتابوں میں بہت مبالغہ آمیز طریق سے بیان کیا گیا ہے لیکن اول تو مارشمین کا بیان ہے کہ آگ دینے والے محافظین میں سے چار انگریز سلامت رہے (صفحہ ۹۶ ۴) دوسرے پورے میگزین میں بھی آگ نہیں لگی بلکہ بہت سا گولہ بارود بچ گیا جو بظاہر حملہ آوروں کے ہاتھ پڑا (اوکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۱۱) اور ان دونوں [illegible] کو پیش نظر رکھنے سے خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میگزین میں واقعی ان انگریز محافظوں نے آگ لگائی یا محض اتفاقیہ آگ لگ گئی تھی۔

[2] انز صفحہ ۴۰۴۔

بعض پہاڑی قبائل نے اس شورش و فساد میں آخر تک انگریزوں کا ساتھ دیا۔

بنگالے اور نربدا کے جنوب یعنی دکن کے علاقوں میں کوئی قابل ذکر ہنگامہ نہیں ہوا لیکن مالوہ اور بندھیل کھنڈ اس آگ کے اثر سے محفوظ نہ رہے بلکہ ان علاقوں میں بہت دن تک اس کے شرارے بھڑکتے رہے اور یہاں امن وامان کے قایم ہونے میں سب سے زیادہ عرصہ لگا۔ اس طوالت کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ان تھوڑی سی گورا یا ولیسی فوجوں کو جو وفادار تھیں سب سے اول شمالی ہند کے مفسدوں سے جنگ کرنی پڑی جن کے دہلی لکھنؤ اور کانپور میں تین بڑے بڑے جنگی مرکز بن گئے تھے۔ دہلی میں باغی سپاہیوں نے بہادر شاہ کی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا اور شہر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی لیکن ضعیف العمر بادشاہ میں نہ انگریزوں سے لڑنے کی قوت و قابلیت تھی نہ آرزو۔ اور بادشاہ کی اولاد دیگر خاندانی امرا یا ان باغی سپاہیوں میں کوئی ممتاز قابلیت کا سردار وسر گروہ نہ تھا۔ لہذا سب سے پہلے انگریزوں کی ایک کم تعداد افواج نے اسی شہر کو گھیر کر فتح کر لیا (ستمبر ۱۸۵۷ء) جس نے اہل شورش کی عام طور پر ہمتیں پست کر دیں۔

مگر اس ہمہ گیر فساد کے سب سے بڑے معرکے اودھ میں ہوئے جہاں اہل شورش نے کچھ عرصے محاصرے کے بعد کانپور اور لکھنؤ دونوں شہروں پر قبضہ کر لیا اور گو لکھنؤ کی گورہ فوج اور انگریز عہدہ دار بچ کر نکل گئے لیکن کانپور کے انگریزوں کو محاصرے کی سخت تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دینے پڑے اور اس جمعیت کے ساتھ بہت سی انگریز عورتیں اور بچے بھی دشمن کے ہاتھ میں قید ہو گئے۔ اس مقام پر اہل شورش کا سرگروہ دھوندو پنت ہو گیا تھا جو نانا صاحب کے عرف سے مشہور ہے۔ یہ شخص آخری پیشوا باجی راؤ کا جسے انگریزوں نے کانپور کے قریب بٹھور میں بسا دیا تھا متبنٰی اور جانشین تھا مگر جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ باجی راؤ کے بعد اس کا پنشن قرار وظیفہ بند کر دیا گیا اور نانا صاحب کو صرف باجی راؤ کا ذاتی ساز و سامان اور تھوڑی سی جاگیر ورثے میں ملی۔ اس وظیفے سے محرومی نے اسے انگریزوں سے ناراض کر دیا اور حق یہ ہے کہ جیسا خوفناک انتقام اس نے لیا شاید کبھی انگریزی قوم سے کسی شخص نے نہ لیا ہو گا۔ یعنی مشہور ہے کہ اول تو جب وہ انگریز جن سے قبول اطاعت کے وقت صحیح سلامت الہ آباد بھیجنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ دریا کے راستے جانے کے ارادے سے کشتیوں میں سوار ہوئے، تو نانا صاحب کے

حکم سے ان پر گولیاں برسائی گئیں اور اس آتش فشانی سے بہت کم انگریز بچ سکے۔ دوسرے سو لیسے زیادہ عورتیں اور بچے نانا صاحب کی حراست میں تھے جس وقت کانپور پر انگریزی فوج نے چڑھائی کی اور نانا صاحب کو اپنی خلاصی کی امید نہ رہی تو انگریز راویوں کا بیان ہے کہ نانا صاحب نے سب انگریز عورتوں اور بچوں کو کمال بے رحمی سے قتل کرا دیا اور ان کی لاشیں ایک کوئیں میں پھنکوا دیں جسے انگریزوں نے اس واقعے کی یادگار میں اب تک محفوظ رکھا ہے۔

اس خوفناک قتل کے دو ہی دن بعد انگریزی فوج کانپور پر قابض ہو گئی تھی (جولائی ۱۸۵۷ء) لیکن نومبر میں اسے گوالیار کی تازہ دم باغی سپاہ سے شکست کھا کر شہر چھوڑنا پڑا اور اس پر آخری مرتبہ انگریزوں کا سال کے اخیر میں قبضہ ہوا۔ پھر تین چار مہینے کی جنگ و کشمکش میں لکھنؤ کی تسخیر (مارچ ۱۸۵۸ء ۱۲۷۴ھ) کے ساتھ وہ اپنے دشمنوں پر پوری طرح غالب آ گئے۔ نانا صاحب اور اس کے بعض رفیق بچ کر نیپال کے علاقوں میں نکل گئے لیکن اودھ میں اہل شورش کی کوئی بڑی فوج باقی نہ رہی اور جب بریلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو روہیلکھنڈ بھی دشمنوں سے صاف ہو گیا اور سال کے ختم تک اس تمام حصۂ ملک کے مقامی فتنہ و فساد فرو ہو گئے۔

مالوہ اور بندھیل کھنڈ

سب سے آخر میں انگریزوں کو مالوے اور بندھیل کھنڈ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی اور یہاں ان کے مشہور سپہ سالار سر ہیوروز نے اول اندور دھار ساگر وغیرہ مقامات پر باغی سپاہیوں کو شکستیں دیں اور آخر میں جھانسی پر چڑھائی کی جہاں کی بیوہ رانی لکشمی بائی نے بڑے پیمانے پر انگریزوں سے جنگ کا سامان کیا تھا۔ واضح رہے کہ جھانسی کی ریاست کو چند ہی سال پہلے قانونِ استقراض کی رو سے ڈلہوزی نے ضبط کیا تھا۔ اور انگریزوں کی اس زیادتی کا انتقام لینے کا جوش تھا جس نے لکشمی بائی کو محل سے نکال کر جنگ کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ ساٹھ ستر انگریز مرد اور اُن کے بیوی بچوں نے جھانسی کے قلعے میں پناہ لی تھی مگر جان بخشی کے اقرار پر انھوں نے اپنے آپ کو باغی سپاہیوں کے حوالے کر دیا تو اس وقت اسی خونخوار رانی کے حکم سے وہ سب قتل کر دیئے گئے (جون ۱۸۵۷ء)۔

اس رانی کے پاس تقریباً بیس ہزار سپاہی جمع ہو گئے تھے۔ نانا صاحب

اس کا مؤید و مددگار تھا اور سب سے بڑی کمک ان فوجوں سے پہنچ رہی تھی جنھوں نے کالپی کو اپنا جنگی مرکز بنا لیا تھا۔ ان فوجوں میں سب سے بڑی تعداد گوالیار کے باغی سپاہیوں کی تھی جہاں اسی زمانے میں ریاست کی فوجیں موقوف کر کے ایک چیدہ "فوج امدادی" (یعنی کن ٹن جنٹ) انگریز افسروں کی ماتحتی میں تیار کی گئی تھی اور اب اس کے سپاہی اپنے نئے حاکموں سے منحرف ہو گئے تھے۔ شاہ اودھ کی سرکار کے بہت سے برطرف شدہ سپاہی بھی ان سے آ ملے تھے۔ آخر میں خود نانا صاحب کا مشہور جنگی سردار تانتیا توپی اسی جتھے میں چلا آیا تھا اور کالپی کے مرکزی مقام سے شمالی مالوہ، اودھ اور بندھیل کھنڈ میں ہر طرف انگریزوں کے خلاف فساد بپا کر رہا تھا۔

اپریل ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ء) میں سر ہیوروز نے جھانسی پر حملہ کیا۔ تانتیا توپی رانی کی مدد کے لئے آیا تھا مگر شکست کھا کے پسپا ہوا۔ رانی کو بھی شہر چھوڑ کر کالپی کی طرف ہٹنا پڑا اور انگریز سپہ سالار نے جھانسی کی تسخیر کے بعد کالپی پر پیشقدمی کی جہاں غنیم نے بڑے اہتمام سے مورچے تیار کئے اور گولہ بارود کی فراہمی کے ساتھ توپ سازی کے کارخانے بھی بنا لئے تھے[1] اس شہر کے قریب پہنچتے پہنچتے انگریزی فوج سے کئی لڑائیاں ہوئیں مگر ہر جگہ اہل شورش کو شکست ہوئی۔ پھر کالپی سے منتشر ہو کر وہ گوالیار کے قریب جمع ہوئے اور ایک بہ ایک اس شہر پر قبضہ کر لیا جس میں بہت سی توپیں اور جنگی ساز و سامان موجود تھا۔ روز اپنے نزدیک کالپی کی لڑائی میں جنگ کا خاتمہ کر چکا تھا۔ مگر اس خلاف توقع واقعے کی اطلاع ملتے ہی دوبارہ بڑھا اور گوالیار میں پھر باغیوں کو شکست دی۔ جھانسی کی رانی بھی اس معرکے میں لڑتی ہوئی ماری گئی (جون ۱۸۵۸ء) تانتیا توپی بھاگ کر نکل گیا تھا مگر سال آئندہ پکڑا ہوا آیا اور پھانسی پائی۔

اس فساد کی جسے عام طور پر "غدر ۱۸۵۷ء" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ آخری بڑی لڑائی تھی اور اس کے بعد باغی سپاہی یا اہل شورش کسی جگہ بڑی تعداد میں جمع نہ ہو سکے اور آہستہ آہستہ سال آئندہ کے اوائل میں یہ شورش فرو ہو گئی۔ گجرات راجپوتانہ، بنگال، اڑیسہ اور جنوبی ہند کے علاقوں میں کوئی قابل ذکر ہنگامہ نہیں ہوا۔ ریاست حیدرآباد اور نیپال سے خود انگریزوں کی مدد کے لئے فوجی دستے بھیجے گئے اور سکھوں نے عام طور پر سرکار انگریزی کا ساتھ دیا حالانکہ

[1] - مارش مین - صفحہ ۵۱۴ -

چند ہی سال پہلے کمپنی نے ان کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ مختصر یہ کہ جو کچھ شورش و جنگ ہوئی وہ ہندوستان خاص یا وسطی ہند کے شمال مشرقی اضلاع میں ہوئی اور یہاں کی نہ صرف فوجوں نے بغاوت کی بلکہ جابجا عام باشندوں نے بھی انگریزوں کی عداوت اور قتل عام میں حصہ لیا اور چند مہینے تک کمپنی کا سارا تسلط اور انتظام درہم برہم کر ڈالا۔ ہر مقام کے فسادات اور ان کے فرو ہونے کے حالات لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ مگر اجمالی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو اہل شورش جن میں سپاہی اور عام لوگ دونوں گروہ شامل تھے، مختلف وجوہ سے انگریزوں کے دشمن ہو گئے تھے لیکن اُن کے سامنے کوئی صاف اور واضح مقصد نہ تھا اور نہ ملک میں کوئی ایسا سرداران کی رہنمائی کو اٹھا جو اُن کو کسی معین راستے پر ڈال دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہنگامہ محض نفرت و انتقام کا ایک طوفان بن گیا جس کی ایک منتظم حکومت کے مقابلے میں دیرپا کامیابی نہ بظاہر ممکن تھی نہ مفید۔

نتائج

مذکورۂ بالا شورش دو سال میں فرو ہو گئی۔ شورش کے خاص مرکزوں میں بھی بہت سے ہندوستانی (سپاہی اور غیر سپاہی) برابر انگریزوں کے وفادار رہے اور انھوں نے جابجا انگریز مردوں اور عورتوں کو اپنے گھر میں چھپایا اور اُن کی جانیں بچائیں۔ امن و امان کے بعد سرکار انگریزی کی طرف سے ایسے خیر خواہوں کو بہت کچھ انعام اکرام ملے۔ لیکن اہل شورش یا عام لوگوں پر جیسا کہ اکثر ایسے ہنگاموں کا نتیجہ ہوتا ہے بڑی سختیاں ہوئیں۔ بہت سے لڑائیوں میں مارے گئے۔ ان کے علاوہ ہزاروں آدمی فوجی عدالتوں کے حکم سے بعض صورتوں میں معمولی شبہات پر سنگین سزاؤں کے مستوجب قرار پائے۔ سچ پوچھئے تو انگریزوں کا غیظ و غضب میں از خود رفتہ ہو جانا قابلِ حیرت نہ تھا جب ہندوستانی رعایا اور ان فوجی سپاہیوں نے جو خود انگریزوں کے دست پرورد تھے۔ سرکار سے انحراف کر کے نہایت بے دردی سے انگریز مرد و عورت کو قتل کیا تو اس سے جس قدر اشتعال ہوتا وہ کم تھا۔ اس اشتعال میں انگریزوں نے بھی جب ان کو غلبہ ہوا۔ تو دہلی، لکھنؤ، اور دیگر مقامات میں جو بغاوت کا مرکز سمجھے گئے تھے اپنے رنج و غضب کے بھیانک نمونے دکھائے اور اُن کے خوفناک انتقام کی جو روایات ہندوستان کے شہروں میں خود ہندوستانیوں میں آج تک مشہور ہیں۔ وہ اگرچہ تاریخی طور پر مستند نہ سمجھی جائیں مگر بے بنیاد بھی نہیں ہیں[1]۔

[1] سر چارلس ڈلک جدت ور اور تک پارلیمنٹ کے رکن رہے اور مقبوضات برطانیہ کے معاملات میں اہل الرائے

مگر اس فتنہ وفساد اور آخر میں سرکار انگریزی کی فتح کے سب سے اہم اخلاقی اور سیاسی نتائج یہ تھے کہ ہندوستان کی عام رعایا جو اب تک انگریزوں کی بہ حیثیت بادشاہ وفرماں روا کوئی خاص وقعت نہ کرتی تھی، اُن سے نہایت خائف ومرعوب ہوگئی۔ بہادر شاہ بادشاہ کی جلاوطنی اور رنگون میں نظر بندی سے خاندانِ تیموریہ کی برائے نام بادشاہی کا بھی خاتمہ ہوگیا اور اُدھر سرکار انگریزی کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کی بادشاہ سمجھی جائیں گی۔ (اواخر ۱۸۵۸ء ۱۲۷۴ھ)۔

نظمائے کمپنی کی اس تغیر کے خلاف تھے لیکن ۵۷ء کے ہنگامے نے اہلِ برطانیہ کو اس قدر پریشان اور کمپنی کی حکومت سے بدگمان کر دیا تھا، کہ نظما کی کوشش کارگر نہ ہوئی اور اگست ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ نے "ہندوستان میں بہتر نظم ونسق کا قانون" نافذ کر دیا جس کی رو سے ممالک ہند کی عنانِ حکومت براہِ راست بادشاہ اور پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آگئی۔ اور مجلسِ وزرا میں ایک "وزیرِ ہند" (سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا) کا اضافہ کیا گیا۔ نیز مجلس نظارت کی بجائے "مجلسِ ہند" (انڈیا کونسل) قائم ہوئی کہ ہندوستان کے معاملات میں وزیرِ ہند کو مشورہ دے۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ: ـــ مانے جاتے ہیں، اپنی کتاب "گریٹر برٹن" میں تحریر کرتے ہیں کہ "یہ بالکل یقینی بات ہے کہ غدر (۱۸۵۷ء) کے فرو کرنے میں صدہا ہندیوں کو اُن انگریز افسروں نے پھانسی پر لٹکوا دیا جو کسی دیسی زبان کا ایک حرف تک نہ جانتے تھے اور نہ شہادت کو سمجھ سکتے تھے نہ صفائی کے بیانات کو..... میں نے ایک افسر سے جو اُن دنوں (بنارس کے قریب) سکرول کی چھاؤنی میں متعین تھا، کہا کہ میرا گمان ہے کہ تم اس بات سے خائف رہتے ہو گے کہ بنارس کے لوگ تم پر حملہ نہ کر دیں تو اس کے جواب میں وہ افسر کہنے لگا کہ سچ پوچھیے تو میں تو دل سے چاہتا تھا کہ بنارس والے حملہ کریں تاکہ ہمیں انھیں سزا دینے اور شہر کو لوٹنے کا موقع ملے جو دو صدی سے نہیں لٹا تھا۔" آج لوگ اس بات میں شبہہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی فوجی ملازمت ہمارے سپاہیوں کو بنی نوع انسان کی جان ومال اور آبرو کی طرف سے بالکل بے پروا بنا دیتی ہے وہ شاید ان خطوط کو بھول گئے جو ۵۷ء میں انگلستان آیا کرتے تھے اور جن میں فوج کا ایک اعلیٰ سردار کانپور پر فوج کشی کے حالات میں اس قسم کی اطلاعیں دیا کرتا تھا کہ "آج کا شکار بہت اچھا رہا۔ باغیوں کا نام ونشان مٹا دیا" اور باغیوں سے جنھیں پھانسی دی جاتی یا توپ سے اڑایا جاتا تھا، یہاں کوئی مسلح دشمن مراد نہ تھا بلکہ معمولی دیہاتی جن پر بغاوت کا بعض شبہہ ہو جاتا تھا۔ غرض اس فوج کشی کے دوران میں دیہات کو جلا کر اور بیگناہ لوگوں کا قتلِ عام کر کے وہ وہ مظالم کیے گئے کہ ان کے سامنے محمد تغلق کے مظالم کی بھی کوئی حقیقت نہیں رہتی..... (دگریٹر برٹن، مطبوعہ ۱۸۶۸ء صفحہ ۹-۳۹۸ نیز دیکھو اکسس ہسٹری صفحہ ۴۴۳)

ہندوستان کے حاکم اعلیٰ گورنر جنرل کے خطاب میں بھی "نائب شاہ" (وائسرے) کا لفظ بڑھا دیا گیا۔

اعلان شاہی

آئین حکومت کے اس رد و بدل کی جس اعلانِ شاہی کے ذریعے ہندوستان میں منادی کی گئی اس کے بعض فقرات تاریخ میں یادگار ہیں۔

"اسی ضمن میں ہم (یعنی ملکۂ انگلستان) رؤسائے ہند سے اعلان کرتے ہیں کہ تمام معاہدات اور قراردادیں جو اُن کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یا اس کے عہد حکومت میں کی گئی ہیں ہم نے قبول کر لیں اور آئندہ ہم بھی اُن کی پابندی کریں گے اور امید ہے کہ رؤسائے موصوف کی طرف سے بھی ان کی پابندی کی جائے گی۔

"ہم اپنے موجودہ مقبوضات ملکی میں کسی اضافے کے خواہاں نہیں ہیں اور جس طرح اس بات کے روادار نہیں کہ ہمارے ملک یا حقوق میں کوئی شخص دست اندازی کرے اسی طرح ہم اس بات کو بھی جائز نہ رکھیں گے کہ ہماری طرف سے کسی دوسرے کے ملک یا حقوق میں دست اندازی کی جائے۔

"ہم کو اقرار ہے کہ ہم پر ہمارے مقبوضات ہند کے باشندوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں وہی فرائض عائد ہوتے ہیں جو ہماری دوسری رعایا کے حقوق سے ہم پر عائد ہوئے ہیں۔ اور ان فرائض کو ہم خداوند تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے صداقت و خلوص کے ساتھ ادا کریں گے۔

"ہم پختگی سے دین مسیحی کی صداقت کے معتقد ہیں اور مذہب سے جو اطمینانِ قلبی حاصل ہوتا ہے اس کا بصد شکر اعتراف کرتے ہیں اور صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ نہ ہم کو یہ حق ہے نہ یہ خواہش کہ اپنے عقائد کو زبردستی اپنی رعایا سے تسلیم کرائیں۔ اس بارے میں ہمارا شاہانہ ارادہ اور مرضی یہی ہے کہ کسی شخص کی اپنے مذہبی عقائد یا شعائر کی بنا پر نہ کوئی رورعایت کی جائے نہ اسے کسی طرح ستایا اور پریشان کیا جائے بلکہ سب کا یکساں طور پر قانون محافظ ہو اور ہم تاکید اکید کے ساتھ ہر شخص کو جو ہمارے ماتحت صاحب اختیارات ہو حکم دیتے اور ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ہماری رعایا کے کسی فرد کے مذہبی عقائد یا عبادت میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کرے ورنہ ہماری سخت ناراضی کا مستوجب ہوگا۔

"مزید براں ہماری مرضی ہے کہ ہماری رعایا کا ہر فرد خواہ وہ کسی مذہب و نسل سے تعلق رکھتا ہو، بلا رو رعایت اور بے تکلف ہماری ملازمت میں داخل کیا جائے جس کے

فرائض ادا کرنے کی وہ اپنی تعلیم، قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے اہلیت رکھتا ہو۔
اعلان کے آخر میں قتل و خون کے مجرم یا ان کے معاونین کے سوا، ۱۸۵۷ء کے تمام ملزمین اور مفسدین کو عام معافی اور امن و اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں میں واپس آنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس وعدے پر کہ آئندہ ہندوستان کی حکومت کی غرض ہی یہ ہوگی کہ اہل ہند کی خوش حالی اور سود و بہبود میں کوشش کرے، یہ مشہور اعلانِ شاہی ختم ہوتا ہے۔

باب (۴)

عہد شاہان برطانیہ

پہلی فصل :- اہم تاریخی واقعات

دنیا کے ملکوں میں بڑے بڑے انقلابات یک بہ یک رونما نہیں ہوجاتے بلکہ سراغ لگایا جائے تو وہ بہت گہرے اسباب پر مبنی اور کسی بعید زمانے سے شروع ہوتے ہیں لیکن اہل تاریخ بالعموم کسی ممتاز سیاسی واقعے کو ایک نئے دور کا آغاز قرار دے دیتے ہیں تاکہ ان کی تاریخ معیّن ابواب و ازمنہ میں باقاعدہ تقسیم ہوسکے۔ اسی آسانی کے خیال سے اگر ہم بھی شاہان برطانیہ کے عہد کو ہندوستان کے "دور جدید" سے موسوم کریں تو کچھ نامناسب نہ ہوگا۔ یہ وہ دور ہے جس کی حدود ہمارے زمانے تک پھیلتی ہیں اور ہر قسم کے تمدنی اور سیاسی تغیرات جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کا نتیجہ ہیں۔ اسی دور میں داخل ہیں۔ مگر جدید یا مغربی تہذیب کے اثرات پر نظر ڈالنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم اس باب کی پہلی فصل میں اس دور کے اہم تاریخی واقعات کو سلسلے وار بیان کردیں۔

کیننگ کے نئے انتظامات

لارڈ کیننگ کی حکومت کے باقی تین سال زیادہ تر ہنگامہ ۵۷ء کی ابتری رفع کرنے میں صرف ہوئے اُس نے اودھ والوں کی شورش کی سزا میں وہاں کے قریب قریب تمام تعلقداروں کی جاگیریں ضبط کرلیں لیکن اس فعل کی خود انگلستان میں مخالفت ہوئی اور آخر کاران میں سے اکثر جاگیریں دوبارہ ایسے لوگوں کے نام واگزاشت کردی گئیں جن کی وفاداری سرکار انگریزی کے ساتھ مسلّم تھی۔

سب سے اوّل اور ضروری مسئلہ شمالی ہند کی دیسی فوج کی تنظیم تھا کہ گزشتہ غدر میں سب سے بڑا حصّہ اسی فوج کے سپاہیوں نے لیا تھا۔ ولسنٹ اسمتھ کے قول کے مطابق ایک لاکھ اٹھائیس ہزار سپاہیوں میں سے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار آدمی انگریزوں سے منحرف اور مخالف ہو گئے تھے۔ ان میں سے بہت بڑی تعداد تو آئندہ معرکوں میں ہلاک ہوئی اور بعض دستے بچ کر نیپال کے جنگلوں میں چلے گئے اور وہیں مر کھپ گئے۔ جو لوگ ہندوستان میں روپوش ہو گئے تھے اگرچہ اعلان شاہی کی رو سے انھیں معافی مل گئی لیکن سرکاری ملازمت اب اُن کو نہیں مل سکتی تھی۔ لہذا کہنا چاہئے کہ کمپنی کی قدیم فوج کا کمپنی کی حکومت کے ساتھ ہی خاتمہ ہوگیا اور اب از سر نو دیسی فوج بھرتی کی گئی مگر یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ شمالی ہند میں دیسی سپاہ گورا فوج کی نسبت دوچند سے زیادہ نہ ہو۔ البتہ جنوبی ہند میں دیسی سپاہیوں کا شمار گورا فوج سے سہ چند رکھا جائے۔ اسی کے ساتھ قرار پایا کہ آیندہ دیسیوں کو توپخانے میں کوئی ذمہ داری کی خدمت نہ دی جائے گی۔ پہلے فوج کو مدراس، بمبئی اور بنگال کے احاطوں کے نام سے تین علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا مگر کچھ عرصے بعد یہ تقسیم اڑا دی گئی اور کل فوج ایک ہی سپہ سالار کے ماتحت "افواج ہند" (انڈین آرمی) کے مجموعی نام سے موسوم ہونے لگی۔[1]

۱۸۵۹ء کے اواخر (۱۲۷۵ھ) میں نیل کی کاشت کا قضیہ پیش آیا۔ دراصل بنگالے میں کچھ عرصے سے بعض انگریزوں نے زمینیں لے کر وسیع پیمانے پر نیل کی کاشت شروع کی تھی اور ہزاروں دیسی مزدوروں کو پیشگی روپیہ دے کر یہ اقرار نامے لکھوا لئے تھے کہ وہ ایک مدّت معینہ تک اپنی نوکری نہ چھوڑ سکیں گے۔ پھر ان مزدوروں یا دیسی کسانوں پر انگریز زمینداروں کی طرف سے طرح طرح کی سختیاں ہونے لگیں اور وہ تنگ آکر نوکریاں چھوڑ کر بھاگے تو اُن پر اور بھی جبر و تشدد کیا گیا۔ بنگالی زبان کا مشہور ناٹک "نیل درپن" انہی کسانوں کی افسوسناک حالت کا مرقع پیش کرتا ہے۔ بنگالے کا لفٹنٹ گورنر ڈھاکے واپس آتا تھا کہ ہزاروں کسان فریادیوں نے اس کو گھیر لیا اور آخر ان کی آہ وزاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ

[1] ۔ اوکس ہس ص ۳۳ وغیرہ واضح رہے کہ پہلے "احاطۂ بنگال" میں تمام شمالی ہند کے صوبے داخل تھے اور اسی لئے شمالی ہند کی تمام فوجیں "بنگال آرمی" ہی کے نام سے موسوم ہوتی تھیں۔

ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوئی۔ انگریز زمینداروں کے مظالم کی روایات صحیح ثابت ہوئیں اور ان کے لکھوائے ہوئے اقرار ناموں کو قانوناً باطل و بے اثر قرار دے دیا گیا۔

کے ننگ کے آخری سالِ حکومت میں پنجاب، راجپوتانہ، صوبۂ آگرہ اور کچھ کے علاقوں میں سخت قحط پڑا اور بعض اضلاع میں قریب قریب نو فیصدی آبادی فاقہ کشی سے ہلاک ہوگئی۔[1]

لارڈ الجن اول۔

مارچ ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں نیا وائسرائے (لارڈ الجن اول) ہندوستان آیا لیکن دو سال کے اندر بیمار ہو کر فوت ہوگیا۔ اس کے عہد کا قابلِ ذکر واقعہ صرف یہ ہے کہ سرحدی قبائل کا قلع قمع کرنے کے لئے ایک انگریزی فوج روانہ کی گئی جسے بہت مصائب اور نقصانات برداشت کرنے پڑے اور یہ مقامی فساد بہ مشکل رفع دفع ہوا۔

سر جان لارنس

اسی سرحدی جھگڑے کی وجہ سے حکومت انگلستان سر جان لارنس کو وائسرائے بنانے پر آمادہ ہوگئی حالانکہ دستور یہ ہوگیا تھا کہ وائسرائے امرائے انگلستان کے طبقے کا آدمی ہو اور براہِ راست ولایت سے ہندوستان بھیجا جائے لیکن گو جان لارنس اب تک ہندوستان ہی میں مختلف ملکی عہدوں پر ملازم رہا اور طبقۂ امرا میں داخل نہ تھا پھر بھی اس کی اعلیٰ قابلیت اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں بیش بہا خدمات مسلّم تھیں اور پنجاب و سرحد کے مسائل سے وہ بالخصوص نہایت عمدہ واقفیت رکھتا تھا۔ ڈلہوزی کا "قانون استقراض" بھی اسی کی رائے سے منسوخ ہوا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سب سے اول اسی کی دانشمندانہ کوششوں نے دیسی ریاستوں کے حاکموں کو فرماں روائے برطانیہ کا نہایت وفادار باجگزار اور بعض صورتوں میں حلیف بنا دیا۔ یہ لارنس ہی کی تحریک سے قرار پایا کہ میسور کا راجہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائے تو حسبِ معاہدہ اس ملک پر سے انگریزی قبضہ اٹھا لیا جائے چنانچہ ۱۸۸۱ء میں اس کے مطابق عملدرآمد ہوا اور حکومت انگریزی کی منصفانہ فیاضی کی ایک بہت اچھی نظیر قائم ہوگئی۔

افغانستان میں انھیں دنوں امیر دوست محمد خاں کے انتقال پر جو ۱۸۶۳ء میں ہوا

---

[1] اوکس ہس صفحہ ۷۳۴ و ماؤنٹس ٹین ۵۲۴
[2] اوکس ہس صفحہ ۷۳۴، ۷۳۶

باب ۸

اس کی اولاد میں جنگ چھڑ گئی۔ اگرچہ اس کا تیسرا بیٹا شیر علی جو پہلے سے سلطنت کے لئے نامزد تھا تخت نشین ہو گیا لیکن اس کے دوسرے بھائی اعظم خاں اور افضل خاں اور افضل کا بیٹا عبدالرحمن خاں شیر علی کے مقابلے میں آمادۂ جنگ ہو گئے چنانچہ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیر علی ۱۸۶۶ء میں کابل سے اور ۱۸۶۷ء میں قندھار سے خارج کر دیا گیا لیکن ۱۸۶۸ء میں پھر یہ دعویداران سلطنت کو ہٹا کر سلطنت پر قابض ہو گیا افضل اور اعظم تو مارے گئے لیکن عبدالرحمن نے بخارا میں پناہ لی اور روس کا وظیفہ خوار ہو گیا۔ انگریزوں کو اس خانہ جنگی میں حصہ لینے کا اچھا موقع تھا اور بعض انگریز اہل الرائے اسے مداخلت کا نہایت اچھا موقع سمجھتے تھے لیکن جان لارنس نے کابل کے اندرونی جھگڑوں میں حصہ لینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ جو شخص اپنے زورِ بازو سے امیر ہو جائے اس کو ہم جائز امیر تسلیم کریں گے۔ چنانچہ جب شیر علی امیر ہو گیا تو لارنس نے اس کو تسلیم کر لیا اور ضرورت کے وقت اس کی مدد بھی کی اور تجربہ گواہ ہے کہ یہی حکمت عملی انگریزی حکومت کے حق میں مفید و سود مند تھی۔

اہل افغانستان کے ساتھ انگریزی تعلقات اور نزاع و جنگ کا حال آگے آتا ہے۔

یہاں لارنس کا یہ کارنامہ بیان کرنا ضروری ہے کہ جب ۱۸۶۵ء (۱۲۸۱ھ) میں اڑیسہ شمالی مدراس اور مشرقی وسط ہند کے علاقوں میں پھر قحط پڑا اور لاکھوں آدمی اول فاقہ کشی سے اور بعد میں کثرتِ بارش کی دریائی طغیانیوں سے ہلاک ہو گئے تو گو جان لارنس ان مصائب کا بروقت انسداد نہ کر سکا تاہم اس نے "امداد قحط زدگان" کے لئے جو تجاویز اور اصول قرار دئے تھے وہ آئندہ نہایت عمدہ دستور العمل ثابت ہوئے اور امداد قحط زدگان کے موجودہ ضوابط و قوانین جان لارنس ہی کے قرار دادہ اصول پر مرتب کئے گئے ہیں۔

لارڈ میو

جنوری ۱۸۶۹ء (۱۲۸۵ھ) میں لارڈ میو ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ وہ آئرلینڈ کے طبقہ امرا کا رکن تھا اور نہایت لائق و مستعد گورنر جنرل مانا جاتا ہے دیسی رئیسوں کے ساتھ لارنس کے دوستانہ طریق عمل کو میو کی ذاتی خوبیوں سے بہت تقویت پہنچی اور دوست محمد خاں کے فرزند امیر شیر علی کو اسی نے ہندوستان میں مدعو کیا اور انبالے میں بڑی دھوم سے امیر موصوف کی دعوت کی۔ اسی ملاقات کے وقت قرار پایا کہ سرکار انگریزی بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور اسلحہ کی ایک مقررہ تعداد امیر کابل کو دیا کرے تاکہ روسیوں کے مقابلے میں وہ انگریزوں کا حلیف رہے حکومتِ انگلستان کی طرف سے بھی سلطنت روس پر زور ڈالا گیا کہ وہ

بدخشاں پر امیر کابل کے حقوق بادشاہی تسلیم کرے اور دریائے سیحوں سے آگے اپنا عمل دخل بڑھانے کی کوشش نہ کرے۔ (۱۸۶۵ء)

لارڈ میو نے مالیات ہند میں بہت سی مفید اصلاحیں کیں۔ دیسی ریاستوں کے امیرزادوں کے واسطے اجمیر، راج کوٹ، اور لاہور میں انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کئے اور قید خانوں کی اصلاح کی دھن میں خود جزیرۂ انڈمان پہنچا تھا، جہاں ایک سرحدی پٹھان کے ہاتھ سے جسے کسی انگریزی عدالت سے عبور دریائے شور کی سزا ملی تھی، مارا گیا۔ (جنوری ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ)۔

دربار قیصری اور قحط ۱۸۷۷ء

میو کے جانشین لارڈ نارتھ بُرک کا زمانہ (۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ) اہم تاریخی واقعات سے خالی ہے۔ لیکن یہ تجویز کہ فرماں روائے انگلستان کے قیصر ہند ہونے کا شاہانہ طریق پر اعلان کیا جائے اسی وائسرائے نے کی تھی جس کی پارلیمنٹ نے بہت بیچار دو قدح کے بعد منظوری دی اور لارڈ لٹن کے عہد میں اس پر عمل ہوا۔ یعنی سلاطین ہند کے قدیم پائے تخت دہلی میں ہندوستان کے رؤسا اور امرا کو جمع کر کے ایک بڑے دربار میں یہ اعلان کیا گیا کہ آیندہ سے ملکۂ وکٹوریہ "قیصرۂ ہند" کے لقب سے ملقب کی جائیں گی (جنوری ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ)۔

مگر اس دربار قیصری کی دھوم دھام اور خوشی کو جنوبی ہند کے خوفناک قحط نے بے لطف کر دیا اور سال آئندہ اس قحط کے اثر سے وسط ہند اور شمالی ہند کے علاقے بھی محفوظ نہ رہے۔ انگریزی عہدہ داروں نے قحط زدہ رعایا کو مدد پہنچانے کی بہت کچھ کوشش و تدبیر کی انگلستان سے بھی لوگوں نے چندہ کر کے روپیہ بھیجا کیونکہ قحط کے سبب سے مہیب اثرات ہندوستان کے انھی علاقوں میں رُونما ہوئے تھے جو براہ راست انگریزی حکومت کے قبضے میں تھے۔ مگر باوجود تمام انسدادی اور امدادی تدابیر کے اندازہ کیا گیا ہے کہ صرف انگریزی علاقے میں تقریباً پچاس لاکھ آدمی خوراک میسر نہ آنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے بری غذا نے جن لوگوں کو امراض وبائی میں مبتلا کر کے عدم کا راستہ دکھایا ان کا شمار اس کے علاوہ ہے[۱]۔

---

[۱] اوکس ہس صفحہ ۴۹۷۔ نیز دیکھو ٹامسن کی مختصر تاریخ ہند صفحہ ۳۹۲ اور کین جلد دوم صفحہ ۳۰۷ جس میں امراض وبائی سے مرنے والوں کو ملا کر اتلافِ جان کا کل شمار ستر لاکھ نفوس بتایا گیا ہے۔

باب۴
جنگِ افغانستان۲

اس بلائے آسمانی کے شدائد سے ابھی تک اٹک پہنچنے نہ پایا تھا کہ افغانستان کی جنگ چھڑ گئی جس کی وجہ سے بعض انگریز مصنفوں اور خاص کر اس زمانے کے اخبار نویسوں نے لارڈ لٹن پر بہت کچھ نکتہ چینیاں کی ہیں؛ لیکن حق یہ ہے کہ ہندوستان میں اتنی بڑی سلطنت اور قوّت حاصل کرنے کے بعد مزید ممالک فتح کرنے کا شوق، قدرتی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسے زمانے میں جبکہ ہند کی حکومت پر ایک ایسا شخص مامور ہو جو خود بھی شاعر تھا اور اس جادو بیان افسانہ نگار کا فرزند بھی تھا جس نے ایک قصے میں قدیم شہر پومپی آئی کے کھنڈروں کو اپنی اصلی و دیرینہ شان میں ظاہر کر کے اُن میں صد ہا برس پہلے کی چہل پہل دکھائی تھی۔ ایسے شخص کو اگر ایشیا میں ایک عظیم الشان برطانوی سلطنت قائم کرنے کے خواب نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی دوسرے کابل سلاطین مغلیہ کا دو صدی تک صوبہ رہ چکا تھا۔ سلطنت روس کی اندیشہ ناک پیشقدمی دیکھکر بھی انگلستان کے بعض حامیان کشورکشائی، ہندوستان کی حفاظت کے لئے اس ملک پر قبضہ یا کسی حد تک عمل دخل رکھنا ضروری سمجھتے تھے کیونکہ روسیوں نے ۱۸۶۵ء میں تاشقند اور ۱۸۶۸ء میں بخارا فتح کر لیا تھا اور اس طرح افغانستان تک ان کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ امیر شیر علی کے ساتھ لارنس و میؤ کے دوستانہ روابط کو نارتھ برگ کے ناگوار طرزِ عمل نے پہلے ہی درہم برہم کر دیا تھا اور اب امیر موصوف علانیہ روسیوں کی طرف مائل نظر آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیر علی نے انگریزوں کے ساتھ جو شرطیں پیش کی تھیں وہ انھوں نے منظور نہیں کیں یعنی ناگہانی موقع پر روپے اور ہتھیاروں سے امداد اور ایک مستقل معاہدہ، نیز اس کے بیٹے عبد اللہ خاں کی جانشینی کا مسئلہ ورپیش تھا لیکن لارڈ لٹن کو وزرائے انگلستان سے اس بات کی منظوری لینے میں کچھ بھی دشواری پیش نہ آئی کہ امیر کابل کو یا تو انگریزوں کی دوستی قبول کرنے پر مجبور کیا جائے وگرنہ اس کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ سلطنتِ انگریزی کو اس کی جانب سے کوئی اندیشہ ہی باقی نہ رہے۱؎

لیکن امیر شیر علی اگر انگریزوں سے دوستی رکھنے پر آمادہ بھی تھا۔ تو ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) میں انگریزوں کے کوئٹہ پر قبضہ کر لینے سے نہایت برہم ہو گیا، بلوچستان کے شمال کا یہ مقام خان قلات کی ریاست میں داخل تھا اور اسی سے مصالحانہ گفتگو کر کے

۱؎ ۔اوکس ہں صفحات ۴۴، ۴۵، ۵۱، و ۵۴ ۔

لیا گیا۔ لیکن جنوب مغربی افغانستان کے مرکزی شہر قندھار سے وہ صرف چند منزل کے فاصلے پر واقع ہے اور کوئٹہ سے درۂ بولان گویا بالکل زد میں آجاتا ہے پس انگریزی فوجوں کا ایسے مقام پر پہنچ جانا امیر کابل کو قدرۃً سخت ناگوار و موجب تشویش ہوا اسی واقعے کے بعد امیر شیر علی نے سلطنت روس سے باقاعدہ دوستی کے عہد و پیمان کئے اور (۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ) میں روسی سفیر کا کابل میں بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔

یہ خبریں سن کر لارڈ لٹن نے بھی ایک سفیر کابل روانہ کیا تھا مگر امیر نے اس ناخواندہ مہمان کا استقبال کرنے سے انکار کیا اور اسی اہانت کی بنا پر سرکار انگریزی نے نومبر ۱۸۷۸ء (اواخر ۱۲۹۵ھ) میں کابل کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ساتھ ہی درۂ خیبر، وادیٔ خرم اور کوئٹہ سے تین انگریزی فوجیں افغانستان پر بڑھیں اور معمولی مزاحمت کے بعد جلال آباد و قندھار پر قابض ہو گئیں، خود امیر شیر علی اس لشکر کشی کی خبر سنتے ہی کابل سے نکل گیا اور بلخ میں روسی امداد کا منتظر تھا کہ بیمار ہو کر وفات پائی اور اس کے فرزند یعقوب خاں نے کچھ مجبوری سے اور کچھ ذاتی اغراض کی بنا پر انگریزوں سے صلح کر لی (عہد نامۂ گندمک مرتبہ مئی ۱۸۷۹ء مطابق ۱۲۹۶ھ) جس کی اہم شرائط یہ تھیں کہ خیبر، بولان وغیرہ دروں پر انگریزوں کا قبضہ رہے گا ان کا ایک مستقل نائب (منسٹر یا ریذیڈنٹ) کابل میں متعین کر دیا جائے گا اور حکومت کابل اپنے بیرونی معاملات میں سرکار انگریزی کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کر سکے گی۔ لارڈ لٹن کو قندھار پر قبضہ رکھنے یا اسے حکومت کابل سے علٰحدہ کر دینے کی خواہش تھی لیکن یعقوب خاں کے کہنے سننے سے یہ شرط معاہدے میں تحریر نہیں کی گئی[۱]۔

اس عہد نامے کے بموجب میجر کواگ نری کو کابل میں سفیر بنا کر بھیجا گیا لیکن لوگوں کے برے تیور دیکھ کر یعقوب خاں نے اسے کابل پہنچتے ہی اطلاع دیدی کہ تمہاری جان خطرے میں ہے، کواگ نری نے اس بات کی چنداں پروا نہ کی اور آخر نتیجہ وہی ہوا جس کا یعقوب خاں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ یعنی افغانی فوج کے بعض دستوں نے قلعے پر جہاں انگریزی سفیر مقیم تھا یک بہ یک حملہ کیا اور سفیر اور اس کے سب ساتھی مارے گئے۔ (ستمبر ۱۸۷۹ء)[۲] انگریزی افواج قندھار میں موجود تھیں۔ اس حادثے کی خبر ملتے ہی

[۱] اوکس ہس صفحہ ۷۵۲ وغیرہ

[۲] ونسنٹ اسمتھ نے لکھا ہے کہ یعقوب خاں نے خود اصرار کیا تھا کہ انگریزی رزیڈنٹ کابل میں آ کر رہے

کابل پر بڑھیں اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد اس شہر پر قابض ہوگئیں، امیر یعقوب خاں خود انگریزی لشکرگاہ میں چلا آیا تھا لیکن کابل پر قابض ہوکر انگریزوں نے اس کی معزولی کا اعلان کردیا اور تجویز کی گئی کہ اس ملک کو کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم کردیا جائے[1]۔ اس تجویز کے مطابق قندھار کو علیحدہ ریاست بناکر، امیر شیر علی کے ایک رشتہ دار کو وہاں کا رئیس منتخب کیا گیا اور گو شمالی افغانستان پر مستقل قبضہ کرنا ابھی تک مخدوش نظر آتا تھا لیکن اس حد تک وزرائے برطانیہ بھی آمادہ تھے کہ قندھار کو کم سے کم باج گزار ریاست کی طرح زیر نگیں رکھا جائے اور وہاں کچھ عرصے انگریزی فوج رکھکر شہر قندھار تک ہندوستانی ریل کا سلسلہ وسیع کردیا جائے[2] مگر اول تو اسی زمانے میں وزارت برطانیہ میں تغیر ہوا جس کی وجہ سے لارڈ لٹن بھی مستعفی ہوگیا (اپریل سنہ ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ) دوسرے افغانستان میں امیر شیر علی کے ایک دوسرے بیٹے ایوّب خاں نے بڑی قوّت بہم پہنچالی اور خاص قندھار پر حملہ کیا جہاں انگریزوں کا سب سے زیادہ زور تھا۔ واضح رہے کہ اس تمام مدت میں کہ انگریزی فوجیں کابل و قندھار، غزنی و جلال آباد وغیرہ قلعوں پہ قابض رہیں آزادی پسند افغان خاموش نہیں رہے تھے بلکہ جب کبھی انگریزی فوجیں اپنے مورچوں سے باہر آتیں، تو اکثر ان کی افغانوں سے لڑائی ہوتی رہتی تھی چنانچہ انگریزوں کو قبضۂ کابل میں اس قدر مالی اور جانی نقصانات اٹھانے پڑے تھے کہ ایک طرف تو حکومت ہندوستان جنگی مصارف کے بار سے دبی جاتی تھی اور دوسری طرف کابل میں جو ہندوستانی فوجیں مقیم تھیں، ان میں سخت بے دلی پیدا ہوگئی تھی[3]۔ بایں ہمہ افغانی جنگجو بالکل بے سروسامان اور نہایت غیر منتظم حالت میں تھے اور اس لئے انگریزوں کے آتشی اسلحہ اور کثرتِ سپاہ کے مقابلے میں ان کی جانبازی کارگر نہ ہوتی تھی۔ پس جس وقت ایوّب خاں نے ہم وطنوں میں ایک حد تک

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ (صفحہ ۷۵۲) لیکن اگر یہ صحیح ہو تو بھی اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کیونکہ روایت کا اصلی اور ضروری جزیہ ہے کہ اگر پہلے اصرار کیا تھا تو بعد میں یعقوب خاں نے خطرے کی اطلاع بھی دیدی تھی (مارش مین صفحہ ۵۳۶)

[1] مارش مین صفحہ ۵۳۸۔ اوکس ہس ۷۵۳۔

[2] مارش مین صفحہ ۵۳۸۔ اوکس ہس ۷۵۴۔

[3] مارش مین صفحہ ۵۳۸ و ۵۴۰۔

انتظام واتحاد قائم کر لیا تو جنگ کی صورت بدل گئی اور قندھار سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر انگریزی سپاہ کو ایک بڑے میدانی معرکے میں شکست کھا کے پسپا ہونا پڑا (جنگ میوند۔ جولائی ۱۸۸۰ء ۱۲۹۷ھ)۔

کابل سے فوراً انگریزی فوجیں مدد کے واسطے آپہنچی تھیں لیکن ادھر تو ان واقعات سے قبضۂ کابل کی دشواریاں بڑھ گئیں اور ادھر حکومت برطانیہ اور نیز نئے وائسرائے لارڈ رپن کا منشا یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو اس جھگڑے سے چھٹکارا لیا جائے۔ لہٰذا جب انہی دنوں امیر شیر علی کا بھتیجا امیر عبد الرحمٰن غالباً روسیوں کی امداد و تحریک سے کابل پر بڑھا اور اپنی بادشاہی کا دعویدار ہوا تو انگریزوں نے بھی ایوب خاں اور افغانستان کو اس کے حوالے کر کے خود اس ملک سے نکل آنا غنیمت سمجھا اور اپریل ۱۸۸۱ء ۱۲۹۸ھ تک کابل و قندھار کے سب علاقے خالی کر کے انگریزی فوجیں واپس چلی آئیں۔

اس طرح دو تین سال کی جنگی تدابیر اور جدّ و جہد کا وہ نتیجہ تو نہیں نکلا جس کی لارڈ لٹن کو آرزو تھی۔ یعنی کابل و قندھار ایک طرف وادی خرم و خیبر سے بھی انگریزی افواج کو واپس بلانا پڑا اور ملک افغانستان کو چند ریاستوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ تاہم ان لڑائیوں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ریاست قلات انگریزوں کے زیر اثر آگئی اور کوئٹہ ان کا مستقل مرکز جنگ بن گیا جہاں سے قندھار پر فوج کشی کرنا آسان ہے نیز وادی خرم گویا اس کی زد میں ہے چنانچہ چند سال بعد آخر اس پر بھی سرکار انگریزی کا فوجی تسلط ہو گیا اور کوئٹہ کی طرح وہاں ایک مستحکم چھاؤنی (یہ مقام پارچنار) قائم کر دی گئی ہے[2]۔

رپن کی ہر دلعزیزی

افغانستان کی جنگ کے خاتمے اور امیر عبد الرحمٰن کے ساتھ مصالحت نے یقیناً ہند اور انگلستان کے بہت سے اہل الرائے کو لارڈ رپن کا شکر گزار بنا دیا۔ لیکن ہندوستان میں اس کی ہر دلعزیزی کے جس پر ونسنٹ اسمتھ اور اس کے ہم خیال انگریز حقارت آمیز حیرت کا اظہار کرتے ہیں[3]، اور بہت سے اسباب تھے۔

---

[1] اوکس ہس صفحہ ۷۵۳ وغیرہ
[2] اوکس ہس صفحہ ۷۵۴۔ مارش مین ۵۴۰۔
[3] ونسنٹ اسمتھ نے یہ بھی لکھا ہے کہ لارڈ رپن بالکل معمولی قابلیت کا آدمی تھا اور اپنے وطن میں سوائے اس کے کہ

یعنی اس کی غیر معمولی اصلاحیں تھیں جن میں سے بعض تو بہت دیرپا اور ہندوستان کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں ان اصلاحوں کو ہم چھ شعبوں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) محاصل مالگزاری۔ (۲) نظم و نسق اور مالی نگرانی کی لامرکزیت۔ (۳) مطبع کی آزادی۔ (۴) تعلیم۔ (۵)۔ دیسی ریاستوں کے ساتھ ہمدردی۔ (۶) سماجی اصلاح۔

پہلی شق میں محاصل کی تخفیف ہے۔ لارڈ نارتھ بروک اور لٹن کے عہد میں آزاد تجارت کا جو اُصول آگے بڑھایا گیا تھا رپن نے اس کی تکمیل کر دی اور خوش قسمتی سے رپن کے عہد میں ہندوستان کا موازنہ بھی نہایت امید افزا تھا کیونکہ سرجان اسٹریچی کی تجاویز اب روبراہ ہو رہی تھیں اور محاصل کی کمی سے نقصان کا اندیشہ نہیں تھا چنانچہ ۵ فیصدی کا محصول درآمد باستثنائے نمک شراب اور اسلحہ کے سب اٹھا دیا گیا۔ مالگذاری کی بابت رپن کی تجویز یہ تھی کہ جہاں ایک مرتبہ بندوبست ہو جائے پھر مالگزاری نہ بڑھائی جائے سوائے اس صورت کے جبکہ بازار میں قیمتیں چڑھ جائیں اور یہ انتظام تقریباً دائمی بندوبست کے لگ بھگ ہو جاتا لیکن یہ تجویز منظور نہیں ہوئی دوسری شق زیادہ اہم ہے یعنی اس عہد میں سب سے پہلے حکومت خود اختیاری کی بنیاد ڈالی گئی دوسرے الفاظ میں لارڈ رپن پہلا انگریز حاکم ہے جس نے اپنی ہندی رعایا کو حکومت خود اختیاری کے نئے راستے پر ڈالا۔ مقامی اور بلدی انتظام کے شعبے میں اپنے معاملات کی نگہداشت سکھائی گئی متعدد قوانین اور ضوابط بنا کر مجالس بلدیہ اور ضلعیہ کا نیا طریق قائم کیا گیا۔ اس کی ابتدا نظم مال کی ابتدائی اکائی تحصیل اور تعلقہ سے شروع کی گئی۔ ان مجالس کے ہاتھ میں ایسے فنڈ دیئے گئے جس کے وہ اہل سمجھے جاتے تھے۔ بڑی مجلسوں کو تعمیرات تعلیم اور دوسرے علم فرائض سپرد کئے گئے جہاں تک ممکن تھا ان مجالس میں اراکین کا انتخاب بھی ہونے لگا تیسری اصلاح یہ تھی کہ لارڈ لٹن نے دیسی اخباروں کے متعلق جو قانون وضع کیا تھا اس کو منسوخ کر دیا گیا اور اس سے دیسی اخباروں کو سیاسی اور سماجی مسائل پر آزادی کے ساتھ بحث کرنے کے مواقع دے گئے چوتھی اصلاح تعلیم سے

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ ایک تجربہ کار و مستعد اہل کار سمجھا جائے کوئی خاص شہرت حاصل نہ کر سکا، (دیکھو کس میں صفحہ ۷۵) لیکن لائق مؤلف کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ ایک غیر قوم کی رعایا میں فقط دماغی قابلیت مقبول نہیں بلکہ کسی حاکم کی ہر دلعزیزی کا اصلی سبب عدل گستری نیک نفسی اور فیاضی کی صفات ہوا کرتی ہیں۔

متعلق تھی۔ ۱۸۸۲ء میں مجلس نظما نے اپنے ایک مشہور مراسلے کے ذریعے سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے بہت زور دیا تھا اور اس کو دوبراہ کرنا تھا۔ رپن نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ۲۰ اراکین کا ایک کمیشن مقرر کر دیا جس نے ابتدائی اور ثانونی تعلیم اور مدارس کے لئے بہت سے ضابطے بنائے اور اس تعلیم کو بہت آگے بڑھایا۔

رپن کی اصلاح ریاستوں سے متعلق یہ تھی کہ اس نے ڈلہوزی کے قانون استقراض کو بالکل منسوخ کر دیا اور جب میسور کا مسئلہ سامنے آیا تو اس کے ساتھ نئے طریقے سے عمل کیا گیا۔ یعنی جس راجہ کو ولزلی نے ۱۷۹۹ء میں گدی نشین کیا تھا وہ بدنظمی کی وجہ سے ۱۸۳۱ء لارڈ بنٹنگ کے عہد میں گدی سے اتار دیا گیا تھا ۱۸۶۷ء میں اس راجہ کا انتقال ہو گیا اور حکومت اس کے متبنی بیٹے کو گدی نشین کرنے کی تجویز پر غور کر رہی تھی ۱۸۸۱ء میں رپن نے اس لڑکے کو گدی نشین کر دیا اور وہاں سے انگریزی علمداری برخاست کر دی گئی۔ آخری شق میں ایک تو کارخانوں کی اصلاح ہوئی جو بہت ضروری تھی یعنی ۱۸۸۰ء میں ایک قانون کے ذریعے سے کام کے گھنٹے مقرر کر دیے گئے اور جو بچے کارخانوں میں کام پر لگائے جاتے تھے ان کی عمر ۹ سے ۱۲ سال مقرر کی گئی اور خطرناک آلات کی حفاظت کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں ایک اور اصلاح کی طرف قدم بڑھایا گیا یعنی یہ کوشش ہوئی کہ ۱۸۷۲ء کے قانون کو جس کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ ہندوستانی انگریزوں کے مقدموں کی سماعت نہیں کر سکتے منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن اب بہت سے ہندوستانی ترقی کرتے ہوئے عدالت سشن تک پہنچ گئے تھے اس لئے ایک نئے قانون کا مسودہ پیش ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ اضلاع کی ہندوستانی عدالتوں کو انگریزوں کے مقدمات میں بھی تحقیقات اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو ہندوستان کے انگریزوں میں لارڈ رپن کے خلاف ایک شور مچ گیا۔ اصلی مسودہ کونسل کے رکن شعبۂ قانون (مسٹر البرٹ) نے مرتب کیا تھا اور انہی کے نام سے تاریخ میں "البرٹ بل" کہلاتا ہے لیکن معترضین کو سب سے زیادہ غصہ لارڈ رپن پر آتا تھا اور اس میں شبہہ نہیں کہ یہی منصف مزاج وائسرائے چاہتا تھا کہ قانون کی نظر میں گورے کالے کا فرق باقی نہ رہے اور ہندوستان کے رہنے والے (غیر سرکاری) انگریزوں یا "برطانیہ کی فرنگی رعایا" کو جو مخصوص امتیاز حاصل ہے کہ ان کے مقدمے کی سماعت صرف انگریز حاکم عدالت ہی کر سکتا ہے، اُسے دُور کر دیا جائے۔ لیکن اضلاع بنگالہ میں نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں نے

"البرٹ بل" کی اس شدت سے مخالفت کی کہ آخر سرکار کو یہ مسودۂ قانون واپس لینا پڑا اور قانون نافذ الوقت میں صرف خفیف ترمیم کر دی گئی (۱۸۸۳ء ۱۳۰۰ھ)۔

باعث تاسیس "کانگریس"

ہندوستان کے انگریزوں کی مذکورۂ بالا مخالفت میں دیسی اخبارات اور ہندوستانی اہل الرائے نے لارڈ رپن کا ساتھ دیا تھا اور اس بحث مباحثے میں فریقین ایک دوسرے کے نہایت مخالف و معاند ہو گئے تھے۔ پھر جب کامیابی انگریزوں کے فریق کو ہوئی تو اہل ہند میں اور بھی ناراضی کا احساس پیدا ہوا اور انھی جذبات کو آئینی حدود کے اندر رکھنے کی غرض سے چند آزاد خیال انگریز عہدہ داروں ہی نے اہل ہند کو ایک "سیاسی انجمن" بنانے کا مشورہ دیا۔ جو ممالک ہند کی قومی انجمن" یا "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس کا پہلا اجلاس جنوری ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں منعقد ہوا۔ اس انجمن کی تاسیس کا اصلی مدعا یہ تھا کہ ملک کے ہر حصے سے ہندوستانی اہل الرائے سال کے سال ایک مقام پر جمع ہوں اپنے قانونی حقوق کے تحفظ کی تدابیر سوچیں اور تمام اہل ملک کی جانب سے اپنی آواز سرکار انگریزی کے اعلیٰ حکام تک پہنچائیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس انجمن کے سالانہ جلسوں نے اس سے بھی بڑھکر جو کام کیا وہ یہ تھا کہ خود اہل ہند کو اپنے سیاسی حقوق سے آگاہ کیا اور ان میں سیاسی بیداری اور قومی خود داری پیدا کر دی۔

لارڈ ڈفرن ۱۸۸۵ء تا ۱۸۸۹ء

رپن کے جانشیں لارڈ ڈفرن کے زمانے میں دوبارہ افغانستان میں مداخلت کا مسئلہ پیش آیا کیونکہ اب سلطنت روس کے ڈانڈے واقعی ملک افغانستان کی سرحدوں سے آملے تھے۔ روسی ریلیں عاشق آباد و سرخس تک جاری ہو گئی تھیں اور مرو کے روسی گورنر (علی خانوف) کے سپاہی درۂ ذو الفقار اور پل خشتی پر مورچے بنا رہے تھے جو امیر کابل کی سرحد سے بالکل متصل مقامات ہیں۔ پھر کابلی سپاہیوں کی ایک مقام (پنج دہ) پر ان سے لڑائی بھی ٹھن گئی جسے کابلی اپنی سرحد کے اندر بتاتے تھے لیکن روسیوں نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا (۱۸۸۵ء ۱۳۰۲ھ)

اس واقعے نے ہند و برطانیہ کے انگریز مدبرین کو نہایت مشتعل کیا اور سلطنت روس کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کی جانے لگیں لیکن اگر لارڈ ڈفرن کے بعض مشیر افغانستان میں فوج بھیجنے پر آمادہ بھی تھے تو خود امیر عبد الرحمن خان نے اس کو گوارا نہیں کیا بلکہ راولپنڈی میں لارڈ ڈفرن سے مل کر صاف صاف جتا دیا کہ افغانستان خواہ تباہ و تاراج ہو جائے انگریزی فوج کا افغانستان میں

باب ۲

آنا ہمیں کسی صورت میں منظور نہ ہوگا۔ باقی سرکار انگریزی اگر افغانستان کی روسیوں کے مقابلے میں پشت پناہ ہونا چاہتی ہے تو جس قدر ہو سکے روپیہ اور جنگی ساز و سامان سے اہل افغانستان کی مدد کرے تاکہ وہ خود روسیوں کی پیش قدمی روک لیں! لارڈ ڈفرن کو بھی مصلحت اسی طریق عمل میں نظر آئی اور امیر عبدالرحمن خاں بارہ لاکھ روپیہ سالانہ کی امدادی رقم کی تجدید و توثیق اور کثیر ساز و سامان جنگ کے ساتھ خوش خوش کابل واپس گیا اور حسب معاہدہ اس نے "دولتِ خداداد و دولت برطانیہ" کے اتحاد کا عام اعلان کر دیا۔ سرحد کابل و روس کا تنازعہ کچھ عرصے بعد فریقین کی باہمی گفتگو سے مصالحانہ طریق پر طے ہو گیا[1]۔

الحاق برما

سرحد ہندوستان کے دوسرے سرے پر برما کا ملک گھٹتے گھٹتے اب ایک چھوٹی ریاست رہ گیا تھا مگر وہاں کا راجہ (تھی بو) انگریزوں کے ساتھ گویا موروثی عداوت رکھتا تھا اور اس نے انہی دنوں فرانسیسیوں کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کیا تھا۔ ڈفرن کو یہ باتیں سخت ناگوار گذریں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں راجہ نے ایک انگریزی کمپنی پر کئی لاکھ روپیہ جرمانہ کیا۔ اور جب سرکار انگریزی نے اُس سے شکایت کی تو معمولی جواب دے کے معاملے کو ٹال دیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ڈفرن اس ریاست کا خاتمہ کرنے کا پہلے سے ارادہ کر چکا تھا لہٰذا انگریزی کمپنی کے معاملے کو لڑائی کا سبب قرار دے کر اُس نے جنگ کا اعلان کر دیا (۱۸۸۵ء) انگریزی افواج کی پیشقدمی کی اہل برما کوئی بڑی مزاحمت نہ کر سکے اور چند ہفتے میں پائے تخت مانڈلے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ راجہ تھی بو کو معزول کر کے ہندوستان لے آئے اور جنوری ۱۸۸۶ء (۱۳۰۳ھ) میں برما کے سلطنت انگریزی میں الحاق کا اعلان کر دیا گیا۔

اہل برما میں افغانوں کی طرح جنگ و جانبازی کا عام جوش نہ تھا اور نہ ان میں کوئی بہادر سردار ایسا پیدا ہوا جو اپنے ہم وطنوں کو قومی آزادی کی خاطر انگریزوں کے مقابلے پر آمادہ کر دیتا۔ تاہم برمی فوج کے برطرف شدہ سپاہی اور قزاقوں کے بعض گروہ بہت دن تک انگریز حکام کو پریشان کرتے رہے اور کامل امن و تسلط الحاق کے پانچ سات سال بعد قائم ہو سکا۔ پھر ۱۸۹۷ء (۱۳۱۴ھ) میں شمالی اور جنوبی برما کو ملا کر ہندوستان کا ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔

ڈفرن کے عہد کے دو واقعات اور قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاست گوالیار کے

---

[1] ۔ اوکسن ص ۷۵۹ ۔ مارشمن ص ۵۴۶ و ۵۴۷ وغیرہ ۔

باب ۴

جھانسی لے کر مُرار کا مقام اور گوالیار کا مشہور قلعہ اس ریاست کے حوالے کر دیا گیا۔ اور دوسرے اوائل ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) میں برطانیہ کی ہردلعزیز ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی پنجاہ سالہ "جوبلی" (یا سالگرہ) منائی گئی۔ اور ہندوستان کے ہر شہر میں دھوم دھام کے جلسے ہوئے۔

سرحدی لڑائیاں

الحاقِ برما کے بعد، بقول ونسنٹ اسمتھ، کوئی اور علاقہ تو ایسا باقی نہیں رہا تھا کہ جسے لیکر ہندوستان کے انگریز حکام اپنے مقبوضات میں مزید توسیع کرتے۔ البتہ سرحدِ کابل کی طرف بہت سے جنگی مسائل تصفیہ طلب تھے اور "کشور ستانی" کا ایک محدود میدان موجود تھا لیکن اس بارے میں ڈفرن کے جانشین لارڈ لینس ڈون پر ہندوستانی اخبار نویسوں اور کانگریس والوں نے جو اعتراضات کی بوچھار کی تھی، اس میں بظاہر ایک حد تک بیجا عیب جوئی اور نافہمی کا بھی دخل تھا۔ درحقیقت امیر عبدالرحمن خاں کی قوت مستحکم ہونے کے بعد وقت کے وقت اس بات کا کوئی قرینہ نہ رہا تھا کہ ملک افغانستان پر انگریزوں کا براہ راست یا بالواسطہ تسلط قائم ہو جائے گا۔ لہذا ضرورت تھی کہ اپنی ہندوستانی سرحد کو ایسے طریقے سے معین و مستحکم کیا جائے کہ اگر دولت کابل انگریزوں کی محکوم نہ ہو سکے تو بھی انگریزوں کے حملے سے ایک حد تک خائف و اندیشہ مند رہے؛ لینس ڈون اس سرحد کو کوہستانِ سلیمان کے مغربی پہلو پر قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ درۂ خیبر کی خاطر خواہ حفاظت ہو سکے۔ اور اگرچہ اس منصوبے میں آزاد سرحدی قبائل سے لڑائیوں کا اندیشہ تھا، نیز جذبہ "کشور ستانی" کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بایں ہمہ نہ صرف سلطنت انگریزی کی شان بلکہ دفاعی ضروریات کو پیش نظر رکھا جائے تو غالباً تسلیم کرنا پڑے گا کہ لینس ڈون کی تجویز قابلِ تعریف تھی نہ کہ لائق اعتراض۔ اسی طرح بلوچستان میں انگریزی نفوذ کو ترقی دینے کے متعلق جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ بھی چنداں وقیع نہیں معلوم ہوتیں۔ سچ پوچھیے تو کوئٹہ پر انگریزی قبضہ ہونے کے وقت ہی سے یہ علاقے سرکار انگریزی کے زیر اثر ہو گئے تھے۔ البتہ یہ مسئلہ صاف نہیں ہوا تھا۔ اور افغانستان میں ایک مستقل حکومت قائم ہونے کے بعد یہ کمی یا بے قاعدگی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی لینس ڈون کو اس کا دور کرنا ضروری معلوم ہوا اور اس نے امیر کابل سے گفتگو کے بعد اس بلوچستانی علاقے کے باقاعدہ انگریزی تسلط میں ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس "الحاق" میں بہت کم نئے اضلاع شامل تھے ورنہ زیادہ تر وہی علاقہ سرکار انگریزی کے پاس رہا جو لارڈ لٹن کے زمانے سے انگریزوں کے اثر میں آ چکا تھا۔

بہرحال جہاں تک امیر کابل سے معاملت کا تعلق تھا، لارڈ لینس ڈاون کی کوششیں خاطر خواہ کامیاب ہوئیں۔ ڈیورنڈ اور سینڈمین جیسے لائق ماتحتوں کی مدد سے بلوچستانی اور شمالی سرحد اچھی طرح معین کرا لی گئی۔ امیر عبدالرحمٰن خاں نے کوئٹے سے چالیس پچاس میل آگے تک انگریزوں کا قبضہ تسلیم کر لیا اور کوہستان سلیمان کے سرحدی قبائل کے علاقے پر جو حاکمانہ حقوق، دولت کابل کو حاصل تھے اُن سے بھی دست بردار ہو گیا۔ یہ حقوق، دراصل محض رسمی تھے ورنہ کابل ہو یا ہندوستان کسی ملک کی حکومت بھی ان آزاد جنگجو قبائل کو آسانی سے کبھی اپنے قابو میں نہیں لا سکی تھی۔ لہٰذا اس پہاڑی علاقے کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے، دولت کابل کا کوئی نقصان نہیں ہوا مگر اس کے معاوضے میں امیر نے اپنی سالانہ امدادی رقم میں ۶ لاکھ کا اضافہ کرا لیا۔

لیکن سرکار انگریزی کو اصلی زحمت اور پریشانی انھی سرحدی قبائل کو محکوم کرنے میں پیش آئی۔ لینس ڈاون تو چھٹے سال عہدے سے مستعفی ہو کر ولایت روانہ ہو گیا (۱۸۹۴ء مطابق ۱۳۱۱ھ) اور بلوچستان کا جہاں تک تعلق ہے، اُدھر کے بلوچ قبائل بھی خاصی طرح انگریزوں کے مطیع و زیرنگیں ہو گئے مگر شمال میں جب مذکورۂ بالا تجویز کے مطابق خیبر اور کوہستان سلیمان کی بلندیوں پر انگریزی چوکیاں قائم کی گئیں، تو وہاں کے "افریدیوں" سے جنگ و جدال کا وہ سلسلہ چھڑ گیا جو درحقیقت آج تک ختم نہیں ہوا ہے۔

چنانچہ اول تو لینس ڈاون کے جانشین لارڈ الجن (ثانی) (۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۹ء بمطابق ۱۳۱۶ھ) ہی کو وسیع پیمانے پر ان سرحدیوں کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی جنھوں نے ۱۸۹۶ء (۱۳۱۴ھ) میں چترال سے بلوچستان تک لڑائی کی آگ بھڑکا دی تھی اور چک دره، سر اگر ہمنی، ٹوچی وغیرہ کئی پہاڑی مقامات پر انگریزی فوجوں کو سخت نقصان پہنچائے تھے۔ اس لڑائی کا سلسلہ، جسے جنگ تیراہ یا "مہم تیراہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دو سال تک جاری رہا۔ اول تو ان پہاڑی اور سرد مقامات کو فتح کرنا کچھ آسان نہ تھا دوسرے انگریزوں کے مقابلے میں عمدہ اسلحہ اور قواعد جنگ کی کمی کو افریدیوں نے اپنے مذہبی جوش اور جانبازی سے خاصی طرح پورا کر دیا تھا اور جا بجا وہ ایسی بہادری سے لڑے کہ انگریزی فوجوں کی ہمت پست ہو گئی۔ پھر جان و مال کے کثیر نقصانات کے بعد اکثر قبائل مغلوب یا صلح پر آمادہ ہو گئے اور ۹۸ء میں "جنگ" کے حسب دلخواہ ختم ہونے کا اعلان ہوا تو بھی درحقیقت ان سرحدی پہاڑیوں کی

شورہ پشتی میں فرق نہیں آیا۔ اور تازہ ترین تاریخ کے انگریز مؤلف کو اعتراف ہے کہ "ان قبائل کی کامل اطاعت آج بھی اسی قدر دور و بعید نظر آتی ہے جتنی کہ ہمیشہ سابق میں دور تھی"[۱] حتیٰ کہ چند سال بعد لارڈ کرزن کو ۱۸۹۹ تا ۱۹۰۵ء (۱۳۲۲ھ) لینس ڈون کے جنگی منصوبے میں ترمیم کرنی پڑی اور "مصالحانہ نفوذ" کا وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی جو بلوچستان میں سنڈمین نے اختیار کیا اور کامیابی حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس وائسرائے نے (سرحدی) انتظام کے اصول یہ قرار دیئے کہ "بڑھی ہوئی فوجی چوکیوں سے انگریزی فوج واپس ہٹائی جائے قبائل سرحدی کے علاقے کی حفاظت کے واسطے خود قبائل ہی کی فوجوں سے کام لیا جائے۔ اور ان کی امداد و حفظ ماتقدم کی غرض سے انگریزی فوجیں ان (قبائل کی فوجوں) کے عقب میں فراہم رکھی جائیں اور ان عقبی مقامات میں ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا جائے"

اُس حکمت عملی کی بدولت سرحدی قبائل کی ایک معقول جمعیت (فرنٹیر ملیشیا) کو فراہم و مرتب کرنا پڑا لیکن اس کا کامیاب ہونا ہی اس کی خوبی کا ثبوت ہے۔ اور لارڈ کرزن کے زمانے میں صرف ایک لڑائی محسودیوں سے پیش آئی۔ سوا سے بھی اہمیت چھپانے کی غرض سے (سرکاری طور پر) فقط "ناکہ بندی" کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا[۲]

لارڈ کرزن جس نے الجن کے بعد ۱۸۹۹ء میں ہندوستان کا جائزہ لیا ہندوستان کے بڑے اور مشہور وائسرائوں میں سے ہے۔ اس کی ذاتی قابلیت اور ذہانت نے ہندوستان میں اس قدر گہرا اثر چھوڑا کہ اس کی مثال دوسرے وائسرائوں میں بہت کم ملتی ہے۔ اس کا کام ڈلہوزی سے زیادہ موثر ثابت ہوا کیونکہ یہاں یہ ایشیا کے بڑے معلومات کے ساتھ آیا تھا۔ خود انگلستان میں کئی اہم خدمات انجام دی تھیں اور ہندوستان کے مسائل پر بھی غور کیا تھا۔ وائسرائے ہونے سے پہلے وہ چار مرتبہ ہندوستان آچکا تھا نیز ایشیا کے اکثر ممالک کا سفر کر چکا تھا۔ اگرچہ اس کے خارجی اور داخلی نظم و نسق پر بہت کچھ ملامت کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ہمہ دانی اور وسعت نظر میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ خارجی اور داخلی دونوں اعتبار سے

لارڈ کرزن کی غیرہر دلعزیزی

۱۔ اوکس ہس صفحہ ۲۶۷ جنگ تیراہ کے حالات میں دیکھو گیبن جلد دوم ۳۵۶ وغیرہ۔

۲۔ اوکس ہس صفحہ ۲۷۷۔ انہی سرحدی قبائل کو خاطر خواہ قابو میں لانے کی غرض سے لارڈ کرزن نے "شمال مغربی سرحدی صوبہ" علیحدہ بنایا تھا (۱۹۰۱ء) جس کا چیف کمشنر براہ راست وائسرائے کے ماتحت ہوتا ہے۔

اس کے عہد حکومت پر روشنی ڈالنی چاہئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت لارڈ کرزن وائسرائے ہو کر ہندوستان آئے اس وقت ہندوستان کے ارد گرد بہت سے خارجی مسائل پیدا ہو گئے۔ سرحدی قبائل سے متعلق ہم اوپر پڑھکر آئے ہیں۔ قبائلی اقطاع ہندوستان کی سیاست کے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ لینس ڈون اور الجن سے جو کام باقی رہ گیا تھا اس کی کرزن نے تکمیل کر دی اور اپنے پیشروؤں سے اسس کا مسلک زیادہ مفید ثابت ہوا لیکن ان اقطاع کی نگرانی سے متعلق اس نے ایک کام اور یہ کیا کہ پنجاب کے وہ اضلاع جو دریائے سندھ کے مغرب میں واقع ہیں پنجاب کی گورنری سے خارج کر کے صوبۂ سرحدی کے نام سے ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا اور اس کو براہ راست وائسرائے کے ماتحت کر دیا تاکہ وائسرائے اور اس کی مرکزی حکومت براہ راست ان اقطاع سے وابستہ رہے اور موقع کی ہر نزاکت کا جواب دے سکے۔ دوسرا خارجی مسئلہ افغانستان سے متعلق تھا۔ امیر عبدالرحمٰن کے انتقال تک جو ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات میں آکر الجھن نہیں پیدا ہوئی کیونکہ امیر موصوف کی قابلیت نے ایکطرف افغانستان میں امن قائم رکھا تو دوسری طرف انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے حالانکہ سرحدی قبائل کی شورش جو لارڈ کرزن اور اس کے پیشروؤں کے عہد میں ہوئی تھی وہ افغانستان کی حکومت کو بھی متزلزل کر دیتی۔ لیکن جب امیر عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا اور ان کا بیٹا حبیب اللہ خاں تخت نشین ہوا دونوں ممالک کے تعلقات پھر کشیدہ ہو گئے۔ انگریزی حکومت حبیب اللہ سے جدید معاہدہ کرنا چاہتی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ عبدالرحمٰن خاں سے شخصی معاہدہ ہوا تھا جو ان کے مرنے کے بعد ٹوٹ گیا لیکن حبیب اللہ نے کہا کہ وہ شخصی نہیں بلکہ وہ معاہدہ دو ممالک کے درمیان ہوا تھا اور وہ اب بھی قائم ہے۔ اس بنا پر کئی سال تک دونوں ممالک کے درمیان نامہ و پیام مسدود ہو گئے اور افغان حکومت نے ہندوستان سے اپنی رقم نہیں لی۔ لیکن تین سال کے بعد ۱۹۰۴ء میں ہندوستان سے ایک سفارت کابل بھیجی گئی جو کئی مہینے وہاں پڑی رہی اور امیر حبیب اللہ خاں نے اپنی کئی شرائط منوا کر پچھلے معاہدے کی تجدید کرائی اور اپنی بقایا رقم وصول کر لی لیکن اس کے ساتھ اپنے کو ہز مجسٹی منوا لیا۔

ایک اور خارجی مسئلہ خلیج فارس سے متعلق تھا۔ ہندوستان کے راستے کو محفوظ رکھنے کے لئے انگریزی حکومت عدن سے لیکر بلوچستان تک تمام ساحلی علاقوں پر اپنا اثر قائم کرنا چاہتی تھی۔

چنانچہ اسی غرض کے لئے، ان ساحلی علاقوں کے رئیسوں سے سیاسی تعلقات پیدا کئے گئے۔ اسی طرح خلیج فارس بھی جو ہندوستان کا ایک دروازہ ہے انگریزی حکومت کے پیش نظر تھی۔ انگریز ارباب سیاست چاہتے تھے کہ خلیج فارس میں دوسری قوموں کا قبضہ نہ ہونے پائے ۱۸۹۲ء میں فرانسیسیوں کو اس سے شکایت پیدا ہوگئی کہ خلیج فارس میں انگریزوں کا تصرف ناجائز ہے۔ دس گیارہ سال کے بعد روسی۔ جرمن اور ترک جیسی دوسری قوموں کو بھی شکایت پیدا ہوگئی۔ ۱۸۹۸ء میں سلطان عمان نے اپنے ساحل پر فرانسیسیوں کو اپنا قدم جمانے کا موقع دیدیا حالانکہ انگریزوں سے اس کے خلاف ایک خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان آگیا تھا۔ اس نے ایک بحری فوج کے ذریعے سلطان کو دھمکی دی اور اس طرح جو رعایت فرانسیسیوں کو دی گئی تھی وہ منسوخ کردی گئی۔ ۱۹۰۰ء میں روس نے بھی اپنا قدم جمانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی بار آور نہیں ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں تو انگلستان کی حکومت نے اس بات کا کھلا اعلان کردیا کہ خلیج فارس میں ہم کسی اور قوم کو مداخلت کا موقع نہیں دے سکتے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایران کے شمال سے روسیوں کی پیشقدمی ہر روز بڑھتی جارہی تھی اور شمالی ایران تقریباً روس کے زیر اقتدار آگیا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ طہران روسی سرحد سے صرف ایک سویل پر رہ گیا تھا۔ تجارت روسیوں کے ہاتھ میں تھی ایرانی فوج میں تمام روسی شامل تھے اور وہ دن دور نہیں تھے کہ ایران کی تمام سلطنت روس میں ضم ہو جائے اور اس طرح یہ خدشہ تھا کہ روسی بالآخر خلیج فارس پر بھی قابض ہو جائیں گے۔ اس لئے اس اعلان کے بعد جو انگلستان سے ہوا تھا لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں خلیج فارس کا بذات خود معائنہ کیا۔ تجارتی مرکزوں پر انگریزی اقتدار بڑھایا گیا۔ جگہ جگہ انگریز قونصل مقرر کئے گئے۔ روسی اور انگریزی حدود اختیار کا تعین کیا گیا۔

خلیج فارس کے معاملے میں لارڈ کرزن کا طرز عمل حق بجانب ہو تو ہو لیکن تبت کے مسئلے میں جو اس کے بعد ہی پیدا ہوا اس کا طرز عمل قابل ملامت معلوم ہوتا ہے۔ یہ الجھن بھی کچھ روس ہی کے لئے بے بنیاد خطرے سے پیدا ہوئی تھی تبت کی سطح مرتفع ہندوستان کے شمال میں واقع ہے۔ اگرچہ دونوں ممالک کے درمیان ہمالیہ کی بڑی دیوار حائل ہے تاہم نیپال۔ سکم اور بھوٹان میں سے کئی درے گذرتے ہیں جو دونوں ممالک کو ملاتے ہیں اور انھیں سے اس ملک کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ انھی خطروں کی وجہ سے وارن ہیسٹنگز کے

عہد سے تبت سے تعلقات پیدا کئے گئے تھے۔ پہلے تو یہ تعلقات تجارتی تھے لیکن بعد کو سیاسی ہو گئے۔ اور جس وقت۔ لارڈ کرزن وائسرائے ہو کر آئے تو دونوں ممالک کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمران تبت دالائی لاما زیادہ لائق اور ذی اثر آدمی تھا۔ لاما جو تبت پر حکومت کرتے ہیں وہ نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ سیاسی حکمران بھی ہوتے ہیں اور یہ شہنشاہ چین کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دالائی لاما جو کرزن کے عہد میں تھا وہ چین سے علیحدہ ہونا چاہتا تھا اور اس کے لئے وہ روسی سلطنت سے جس کے حدود تبت سے ملتے تھے رشتہ جوڑنے لگا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص ڈورچیف نامی دونوں ممالک کے درمیان مراسلت کرتا تھا روسی حکومت کے لئے بھی یہ اچھا موقع تھا۔ اس سے انگریز بہت گھبرائے۔ ڈر یہ تھا کہ اگر روسی تبت پر مسلط ہو جائیں تو وہ ہندوستان پر بھی حملہ کر سکتے ہیں حالانکہ یہ بہت بعید از قیاس چیز تھی۔ لارڈ کرزن نے تبت میں ایک سفارت بھیجنی چاہی۔ لیکن انگلستان کے وزرا اس کے مخالف تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس کے متعلق چین سے گفت و شنید ہونی چاہئے کیونکہ تبت چین کے ماتحت تھا لیکن کرزن کے زور دینے سے راضی ہو گئے اور ایک سفارت ۱۹۰۳ء میں کھمباجونگ بھیجی گئی جو سکم سے ۱۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے تاکہ یہاں چین اور تبت دونوں ممالک کے نمایندوں سے گفت و شنید ہو سکے۔ چین کے نمایندے تو حاضر ہو گئے لیکن تبتیوں نے گفت و شنید میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ سفارت پیچھے ہٹ کر اپنے حدود میں چلی جائے۔ اور ان کا یہ مطالبہ بہت معقول تھا نتیجہ یہ ہوا کہ معاملات بہت دنوں تک رکے رہے اور اس دوران میں تبتی حکومت نے فوج جمع کر لی۔ انگریزوں نے بھی پیشقدمی کی اور گورو کے مقام پر تبتی فوج سے افسوسناک مقابلہ ہوا جس میں ۷۰۰ تبتی سپاہی مفت میں مارے گئے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ برطانوی فوج کے جدید آلات حرب کے سامنے تبت کی بے ڈھنگی بے دست و پا فوج کی کیا چل سکتی تھی۔ انگریزی فوج لہاسا تک بڑھتی چلی گئی۔ جو تبت کا پائے تخت ہے۔ لاما بھاگ گیا بالآخر تبتی حکومت نے دب کر صلح کر لی۔ اگرچہ انگریز حکومت نے پہلے سخت شرائط لگائے تھے۔ یعنی ۷۵ لاکھ کا تاوان جنگ دیا جائے نیز تبت کے خارجی تعلقات انگریزوں کے زیر اثر رہیں اور وادی چمبی پر قبضہ ہو گا جو سکم اور بھوٹان کے درمیان ہے اور برطانوی تجارتی کارندے کا تسلط ہو گا۔ لیکن انگلستان کی حکومت نے اس میں تخفیف کر کے ۲۵ لاکھ تاوان جنگ اور وادی چمبی کا تین سالہ

قبضہ مقرر کیا۔ بایں ہمہ تبتی حکومت پر بڑی زبردستی ہوئی جس کی ذمہ داری لارڈ کرزن پر آتی ہے۔
لارڈ کرزن کا اندرونی نظم ونسق کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ اس کے بعض کام سخت ناراضی کے باعث ہوئے تاہم بہت سے امور میں اس نے غیر معمولی قابلیت سے کام لیا جسکے بہت دیرپا اثرات ہوئے۔ اس نے تمام آلات حکومت کی از سر نو چھان بین کی۔ نئے سررشتے بنائے اور بڑے محکموں میں کارکردگی پیدا کر دی۔ یہ عجیب بدقسمتی تھی کہ لارڈ کرزن کا عہد حکومت برے حادثات سے شروع ہوا تھا۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے لوگوں کو قحط وطاعون کی آسمانی بلاؤں سے وہ تکلیف ومصیبت اٹھانی پڑی کہ شاید پہلے کبھی پیش نہ آئی تھی۔ تاریخی طور پر شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں وبائے طاعون کے پھیلنے کا ثبوت ملتا ہے اور اس موقع پر بھی اس وبا نے ہزارہا آدمیوں کی جان لی اور ہندوستان خاص کے اکثر مقامات میں سخت تہلکہ ڈال دیا تھا۔ مگر یہ وبا چند سال میں دفع ہوگئی۔ برخلاف اس کے لارڈ ایلجن کے زمانے میں جس طاعون (ہونگ پلیگ) کا بمبئی سے آغاز ہوا (سنہ ۱۸۹۶ء) وہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے ہر حصے میں پھیل گیا اور آج چالیس برس کے بعد بھی اس کے دفع ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن شاید طاعون سے بڑھ کر پریشان کن سنہ ۱۸۹۷ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے خوفناک قحط تھے جنھوں نے "ہندوستان خاص" اور وسط کے علاقوں میں سخت تباہی اور ہلاکت پھیلا دی۔ ان قحطوں میں لاکھوں آدمی بھوک سے مرے جن لوگوں کی اس قدر خراب حالت نہ تھی وہ بھی فاقہ کشی اور گرانی کی تکلیف سے محفوظ نہ تھے اور ان مصائب نے عام طور پر اہل ہند میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر دی تھی۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کا باعث نہ صرف بارش کی کمی بلکہ لگان کی زیادتی اور انتظام مالگزاری کی خرابی بھی ہے۔ لارڈ کرزن نے اس طرف خاص توجہ کی چنانچہ اراضی اور انتظام اراضی سے متعلق اس کی کوششیں یہ تھیں۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں "قانون بے دخلی اراضی پنجاب" وضع کیا گیا جس کی رو سے کاشتکاروں کے حقوق کی حفاظت کر دی گئی۔ زمیندار کاشتکاروں کو آسانی سے بے دخل نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے سرکاری مطالبات اراضی موسم کی نوعیت پر منحصر کی گئی۔ اگر موسم خراب ہو جائے تو مطالبات خفیف ہونے چاہئیں۔ تیسرے انجمنہائے امداد باہمی قایم کی گئیں جو کاشتکاروں کو کم شرح پر قرض دینے لگیں اور ایک محکمۂ زراعت قائم کیا گیا جس میں تحقیق زراعت کا شعبہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ تجارت اور صنعت وحرفت کا

ایک جدید محکمہ بھی بنایا گیا۔

ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی لارڈ کرزن کے زمانے میں سرکار انگریزی کی مداخلت اور نگرانی بڑھ گئی۔ جیساکہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں برار کا دوامی پٹہ اسی وائسرائے کے عہد میں ہوا۔ مگر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ جو بات ناگوار گزری وہ لارڈ کرزن کا نیا قانون جامعات "(یونی ورسٹیز ایکٹ) مجریہ ۱۹۰۴ء (۱۳۲۱ھ) ہے جس نے تعلیمی معاملات میں سرکار کے دخل و اختیار کو بہت بڑھا دیا اور ہندوستانی اہل الرائے نے عام طور پر اس قانون کو اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے منافی اور مخالف قرار دیا۔ ابھی یہ ناراضی کم ہونے نہ پائی تھی کہ لارڈ کرزن نے (چند مہینے ولایت میں رہ کر) دوبارہ ہندوستان آتے ہی "تقسیم بنگال" کا اعلان شائع کیا (۱۹۰۵ء، ۱۳۲۲ھ)

اس میں شبہ نہیں کہ بنگال کا صوبہ جس میں اُن دنوں بہار و اڑیسہ بھی داخل تھے۔ بہت بڑا تھا اور مشرقی بنگال کو علحدہ صوبہ بنانے سے وہاں کے مسلمانوں کو بھی ایک حد تک فائدہ پہنچنے کی امید تھی۔ لیکن ہندو بنگالی اس تقسیم کے نہایت مخالف تھے اور ان کا قول تھا کہ اس تقسیم سے بنگالی قوم کی متحدہ قوت کو توڑنا اور اہلِ بنگال میں باہمی اختلاف پیدا کرنا مقصود ہے۔ تھوڑے دن بعد اس مخالفت نے تحریر و تقریر سے گزر کر قاتلانہ سازش کی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ یعنی بنگالے میں بعض اس قسم کی خفیہ انجمنیں بنائی گئیں جن میں بم سازی کی تعلیم اور انگریز عہدہ داروں کو قتل کرنے کی تدابیر سوچی جاتی تھیں۔ یہ خیالات آخر میں پنجاب و مہاراشٹر کے نوجوانوں تک بھی پہنچ گئے لیکن اس قسم کے قتل و خون کی زیادہ وارداتیں بنگالے ہی میں ہوئیں۔ انجام کار لارڈ کرزن کی "تقسیم بنگال" کو منسوخ کرنا پڑا اور مشرقی بنگال کی بجائے صرف بہار و اڑیسہ کو ملا کر ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا گیا (۱۹۱۲ء، ۱۳۳۰ھ)۔

آثار قدیمہ اور شاہی دربار

لارڈ کرزن کے شاہانہ مزاج سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ہندوستان کی قدیم شاہی عمارات کی حفاظت و نگرانی کا سرکار کی طرف سے معقول انتظام کر دیا گیا اور ہر صوبے نیز بعض بڑی ریاستوں میں "آثار قدیمہ" کے مستقل محکمے قائم ہوئے جن کے عہدہ داروں کا کام ہی یہ ہے کہ قدیم عمارات، کتبات وغیرہ کی تلاش اور اُن کے تحفظ و بقا کی کوشش کرتے رہیں اور اس کام کے لئے سرکاری طور پر ہر سال بہت سا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

لارڈ کرزن کے زمانے کے دو قابلِ ذکر واقعے جن کا ترتیب سنین کے اعتبار سے

باب۴

اوپر ذکر آنا چاہیئے تھا۔ یہ ہیں کہ جنوری ۱۹۰۱ء[1] میں ملکہ وکٹوریہ نے وفات پائی اور
شاہ اڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوئے۔ مگر بعض ناگزیر وجوہ سے انگلستان میں ۱۹۰۲ء سے پہلے
تاجپوشی کا جشن منعقد نہ ہو سکا۔ اسی لئے ہندوستان میں بھی یہ رسم ۱۹۰۲ء کے اخیر بلکہ جنوری ۱۹۰۳ء میں
منائی گئی۔ اس غرض سے دہلی میں بڑی دھوم دھام کا "دربار تاجپوشی" منعقد ہوا اور اس میں
ہندوستان کے اکثر رئیس، راجہ و مہاراجہ، نواب وامرا مدعو کئے گئے۔ پھر دس برس بعد
جب شاہ اڈورڈ ہفتم نے وفات پائی تو اسی قسم کا دوسرا شاہی دربار دوبارہ ۱۹۱۱ء کے اواخر میں
منعقد ہوا اور اس کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس دربار میں خود قیصر ہند شاہ جارج پنجم
ہندوستان تشریف لائے۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ بادشاہ انگلستان ہندوستان میں آکر جشن تاجپوشی
منعقد کریں۔ ممالک ایشیا کی تاریخ میں اس کو ایک یادگار واقعہ سمجھنا چاہیئے؛

لارڈ منٹو، لارڈ ہارڈنگ، چیمز فورڈ

مگر یہی تاریخ کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں مختصر طور پر یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ
لارڈ کرزن کا جانشین منٹو (ثانی) ہوا (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۰ء = ۱۳۲۸ھ) اور بنگالے اور دیگر
مقامات کی شورش کے انسداد کی غرض سے "قانون مجالس باغیانہ" اور "قانون اخبارات"
اسی وائسرائے کے عہد میں نافذ ہوئے۔ خفیہ پولس کے محکمے میں بہت توسیع و ترقی دی گئی اور
تحریر و تقریر کی آزادی پر سخت قیود عائد کر دی گئیں کہ شورش انگیزوں کی خطرناک کوششوں کا
سد باب ہو، مگر سچ پوچھئے تو اہل ہندوستان کی شورش و ناراضی کو دفع کرنے کی سب سے
بہتر تدبیر ان "آئینی اصلاحات" (مجریہ ۱۹۰۹ء = ۱۳۲۷ھ) کا نفاذ تھا جن کی بدولت اہل ہند کو
سرکاری معاملات میں حصہ لینے کا پہلے سے زیادہ موقع ملا، اور مجموعی طور پر ان کی سیاسی قدر و منزلت
بڑھ گئی۔

لارڈ منٹو کے جانشین لارڈ ہارڈنگ ثانی (۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۶ء = ۱۳۳۴ھ) کے
عہد حکومت کا ایک مشہور واقعہ تو وہی شاہی دربار ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ مگر
جنگ ہائے طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے ہنگامے سے ہندوستانی مسلمانوں میں

---

[1] اسی سال (۱۳۱۸ھ) امیر عبدالرحمٰن خان والی کابل کا انتقال ہوا اور امیر حبیب اللہ خاں اس کے جانشین ہوئے اور تھوڑے دن بعد سرکار انگریزی نے تسلیم کر لیا کہ نئے امیر کو سرکاری طور پر "ہز مجسٹی" کے، بادشاہی لقب سے مخاطب کیا جائے۔

عام ہیجان پیدا ہونے کے علاوہ، لارڈ ہارڈنگ کے زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء (۱۳۳۲ھ) میں دول یورپ کے درمیان جنگ عظیم چھڑ گئی اور اس میں شرکت کے لئے ہندوستانی افواج بہ تعداد کثیر یورپ، افریقہ اور عراق عرب روانہ کی گئیں جہاں انھوں نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیے۔

۱۹۱۶ء میں جب لارڈ ہارڈنگ کی میعاد حکومت ختم ہوئی تو ہندوستان کی حکومت لارڈ چیمز فورڈ کو دی گئی۔ اس وائسرائے کے عہد میں بھی کئی سال تک یورپ کی جنگ جاری رہی اور آخر اس کا فرانس و برطانیہ کی فتح و کامیابی پر اختتام ہوا۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ میں لارڈ چیمز فورڈ کا عہد سب سے زیادہ اس وجہ سے یادگار رہے گا کہ اہل ہند میں اپنی وطنی یا قومی حکومت قائم کرنے کا خیال اسی زمانے میں پھیلا اور ان کے سیاسی مطالبات و مقاصد میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو گیا؛ اس وقت جنگ عظیم کے آہستہ آہستہ اثرات بھی پڑ رہے تھے۔ جو ہندوستانی سپاہی یورپ کی لڑائیوں سے واپس آ رہے تھے جدید سیاسی خیالات اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ نیز دوران جنگ میں اہل ہند نے سلطنت برطانیہ کی جس جاں نثاری کے ساتھ خدمت کی اور نہایت نازک وقت پر جان و مال سے مدد دی اس کا برطانیہ کے بڑے بڑے مدبرین اور وزرا نے بھی اعتراف کیا۔ لیکن ان خدمات کا اچھا صلہ نہیں دیا۔ بلکہ جب ملک میں سیاسی بے چینی پیدا ہو گئی تو اس کے سد باب کے لئے مسٹر جسٹس رولٹ کے تحت ایک کمیٹی بیٹھا دی اور اس کی سفارشوں کو قانون رولٹ کی صورت میں پاس کر دیا جس کی رو سے عدالتوں اور صوبہ واری حکومتوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ غیر آئینی طریقے سے سیاسی مقدمات کا جلد فیصلہ کریں۔ ادھر "قانون رولٹ" کے نفاذ سے لوگ بہت برہم ہوئے اور ادھر سلطنت عثمانیہ کی شکست اور بعد میں ترکوں کے ساتھ حکومت برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے برتاؤ سے ہندوستانی مسلمانوں کو نہایت مایوسی اور اشتعال ہوا۔ ان اسباب نے ہندو مسلمانوں کو سیاسی مطالبات میں باہم متحد کر دیا اور ان کے سیاسی شور و شغب کو روکنے کے لئے سختی کی گئی۔ چونکہ شورشیں زیادہ تر پنجاب میں ہو رہی تھیں اس لئے پنجاب کے چند اضلاع میں "جنگی قانون" (مارشل لا) کا نفاذ ہوا۔ صدہا اشخاص سرکار سے ناراضی پھیلانے کے الزام پر گرفتار کئے گئے۔ کئی مقامات پر ہوائی جہازوں سے بم کے گولے برسائے گئے۔ مشتبہ مجمعوں کو منتشر کرنے کے لئے کئی بار "مشین گن" استعمال کی گئی اور اس میں

باب۷

سب سے زیادہ سختی شہر امرتسر کے "باغ جلیان والا" میں ہوئی جہاں کسی میلے یا جلسے میں جمع ہونے والوں پر ایک انگریز افسر (جنرل ڈائر) نے باڑیں مارنے کا حکم دیا اور صدہا آدمی ہلاک اور مجروح ہوئے۔ ان واقعات نے سیاسی شورش کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔

باب ۵

جنگ کے بعد کا زمانہ

۱۹۱۹ء کے بعد سے جبکہ یورپ میں صلح ہوگئی ہندوستان میں بہت سخت سیاسی بےچینی کا زمانہ شروع ہوتا ہے قانون رولٹ کی تو پہلے سے مزاحمت کی جاتی تھی۔ اس کا ذکر اوپر آیا ہے کہ جلیان والا باغ کی خونریزی اور جنرل ڈائر کی جو حمایت ہوئی تو اس سے اور آگ بھڑک گئی مسلمان اس وجہ سے بےچین تھے کہ ترکوں کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا گیا تھا اور مقامات مقدسہ کے متعلق جو وعدے ہوئے وہ سب فراموش کر دیے جا رہے تھے۔ نیز امیر امان اللہ خاں نے جو اپنے باپ کے انتقال کے بعد والی کابل ہوئے تھے ہندوستان پر کامیاب حملہ کر دیا اور آزادی حاصل کر لی۔ اس سے سیاسی بیداری میں بہت اضافہ ہوا۔ اور حکومت سے مخالفت بڑھنے لگی۔ اور مہاتما گاندھی نے جو ہندوستان کے مشہور رہنما ہیں ہندوستانیوں کو ستیا گرہ یعنی خاموش مقابلے کی تعلیم دی۔ ۶ اپریل کو ہڑتال کا دن مقرر کیا۔ اس روز ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس کے مظاہرے ہوئے۔ چونکہ اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں میں غایت درجہ کا اتحاد تھا اس لئے ان مظاہروں میں دونوں قومیں برابر کی شریک تھیں ان مظاہروں میں اکثر جگہ تشدد بھی ہو گیا اور حکومت کو گولی چلانی پڑی۔ لاہور میں مارشل لا جاری کر دیا اور ہندوستانیوں کی جگہ جگہ بے عزتی کی گئی۔

اصلاحات مانٹیگو چیمسفرڈ

اسی سال مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات بھی پارلیمنٹ سے پاس ہوئیں جو ہندوستان کی بےچینی کا لازمی نتیجہ تھا اس کام کے لئے وزیر ہند مانٹیگو ۱۹۱۷ء میں ہندوستان آ گئے تھے

اور وائسرائے ہند نے لارڈ چیمسفرڈ کے ساتھ ہندوستان کا مطالعہ کر کے ایک رپورٹ تیار کی جو ۱۹۱۸ء
میں شائع ہوئی اس رپورٹ میں جو تجویزیں پیش کی گئی تھیں وہ ۱۹۱۹ء میں قانون پارلیمنٹ کی
شکل میں پاس ہوئیں۔ ان اصلاحات کا ایک مختصر خاکہ تو آگے دیا جائے گا لیکن یہاں یہ ذہن نشین
رکھنا چاہیے کہ ان اصلاحات سے ہندوستانیوں کی تشفی نہیں ہوئی یہ معتدل خیال کے لوگ بھی جو حکومت
کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے تیار تھے اس سے ناراض ہو گئے کیونکہ کانگرس اور مسلم لیگ
دونوں نے متحدہ طور پر سوراج یعنی حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا تھا اور یہ ان اصلاحات سے
حاصل نہیں ہوا۔ صدیوں میں حکومت اختیاری کی ایک بے ڈھنگی شکل پیدا کی گئی تھی جو کسی کے
سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۱۹۲۰ء میں قانون ساز مجلسوں کا انتخاب ہوا تو اس میں
کانگرسی شریک نہیں ہوئے بلکہ اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو
وہ شرائط صلح بھی شائع ہوئے جو یورپ کی سلطنتوں نے ترکوں کے ساتھ طے کئے تھے۔ شرطیں سخت
نامنصفانہ تھیں۔ ترکی سلطنت کے تمام ایشیائی مقبوضات چھین لئے گئے اور یورپ کے اکثر
مقبوضات یونان کو سپرد کرنے کی تجویز تھی۔ دوسرے الفاظ میں خلافت کا خاتمہ تھا۔ اس سے
ہندوستان تو کیا تمام دنیا کے مسلمانوں کو دلی صدمہ ہوا۔ ہندوستان کے مسلمان اس قدر مایوس
ہوئے کہ افغانستان میں ہجرت کرنے لگے۔ اور خلافت کو زندہ کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر
کوششیں شروع کر دیں جس کو تحریک خلافت کہتے ہیں اور خلافت کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔
ہندوؤں نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ چونکہ اس سے پہلے پنجاب کے دلخراش واقعات
اور مانٹفرڈ اصلاحات سے بڑا غیظ و غضب پیدا ہو گیا تھا خلافت کے مسئلے سے اور اشتعال
پیدا ہوا اور گاندھی جی نے حکومت کو پریشان کرنے کے لئے ترک موالات کا سبق دیا کہ حکومت
کے ساتھ اتحاد عمل نہیں کرنا چاہیے۔ ترک موالات کی تحریک کا منشا صرف یہ نہیں تھا کہ صرف
مانٹفرڈ اصلاحات سے قطع تعلق کیا جائے بلکہ حکومت سے تمام تعلقات منقطع کئے جائیں۔ یہ تحریک بڑے
زور سے شروع ہوئی وکلا نے وکالت چھوڑ دی۔ سرکاری ملازمین مستعفی ہونے لگے اور طلبہ نے
سرکاری مدارس سے علیحدگی اختیار کی اور ان کی تعلیم کے لئے کئی قومی مدارس اور تعلیمی ادارے قائم
کئے گئے۔ ناگپور کانگرس نے جو ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی تھی اس تحریک کو منظور کیا اور گاندھی جی کی
پوری تائید کی۔

۱۹۲۱ء میں لارڈ چیمسفرڈ کی مدت ملازمت ختم ہو گئی اور ان کی جگہ اپریل کے مہینے میں

انگلستان کا مشہور قانون داں مدبر لارڈ ریڈنگ وائسرائے بناکر بھیجا گیا۔ جدید وائسرائے نے تحریک ترک موالات کا سختی سے مقابلہ کیا۔ جدید قوانین پاس کئے گئے بڑے بڑے لوگوں کے علاوہ جو اس تحریک ترک موالات میں شریک تھے تیس ہزار آدمی گرفتار ہو گئے۔ جب یہ تحریک ملابار پہنچی اور وہاں کے باشندوں نے جو موپلا کہلاتے ہیں حصہ لیا تو ان پر طرح طرح کی سختیاں کی گئیں۔ ۱۹۲۲ء میں موپلا نے کھلی بغاوت کردی۔ ان کا بری طرح سر کچلا گیا۔ لیکن یہ تحریک دبی نہیں بلکہ جب ۱۹۲۲ء میں شاہزادہ ویلز ہندوستان کے دورے کے لئے آئے تو اہل ہند نے ان کا خیر مقدم نہیں کیا۔ گاندھی جی نے ایک قدم اور آگے رکھا یعنی سول نافرمانی کا بڑا ہتھیار استعمال کرنے کی تیاری شروع کردی کہ حکومت کو محصول و لگان نہ دیا جائے۔ گنٹور میں سب سے پہلے اس کی بنیاد ڈالی گئی اور خود گاندھی جی نے گجرات کے تعلقہ برودلی میں یہ کام شروع کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳ مارچ ۲۲ء کو گاندھی جی گرفتار ہو گئے اور چھ سال کے لئے قید میں ڈال دیے گئے اور اسی زمانے میں آندھرا اضلاع کے بھی بہت سے لوگ گرفتار ہوئے اگرچہ گاندھی جی کے قید ہونے کے بعد کچھ دنوں تک سیول نافرمانی کی تحریک باقی رہی اور اس کام کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جو ملک میں دورہ کرتی تھی لیکن کانگریس کا ایک طبقہ سی آر۔ داس کے تحت اس تحریک کا مخالف ہو گیا اور اپنے کو سوراجی فریق کا نام دیکر کونسلوں میں داخل ہونے لگا۔ دوسری خرابی یہ ہوی کہ ۱۹۲۲ء سے ہندو مسلم کشیدگی شروع ہوگئی اور دونوں فرقوں کے زور وشور سے فسادات ہونے لگے اور اس وجہ سے ترک موالات کا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

صحت کی خرابی کی وجہ سے گاندھی جی کو بہت جلد رہا کر دیا گیا چنانچہ یہ ۱۹۲۴ء میں رہا ہو گئے۔ چونکہ اس وقت کانگریس کے اراکین میں بہت اختلاف تھا اس لئے مختلف طبقوں کو ایک نقطے پر جمع کرنے کے لئے ایک کل فریق کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس نے حکومت کی سختیوں کی مخالفت کی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک لائحہ عمل بنایا۔ نیز کانگریسیوں اور سواراجیوں میں اتحاد کرنے کی کوشش کی۔ اسی سنہ میں انگلستان کی پرانی وزارت بدل گئی اور اس کی جگہ لیبر وزارت قائم ہوگئی۔ چونکہ انگلستان کا لیبر فریق ہندوستان کا بہت ہمدرد تھا اور کئی سال پہلے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری ملنی چاہیے اس لئے اس تبدیلیٔ وزارت سے ہندوستانیوں کے جذبات میں ایک اضافہ ہوا اور ادھر حکومت نے سر مڈی من کے تحت ایک کمیٹی اس غرض سے منعقد کردی کہ مانٹی فرڈ اصلاحات کی رفتار پر

غور کرے کہ آیا اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ انگریز اراکین نے جن کی کثرت تھی کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں بتائی البتہ چند ہندوستانی اراکین نے جن میں تیج بہادر سپرو اور محمد علی جناح تھے اس بات پر زور دیا کہ دستور کی از سر نو تبدیلی ہونی چاہیے۔ کیونکہ صوبوں کی دو عملی تو ایک بے ڈھنگی چیز تھی۔ خود اعتدال پسندوں نے اس سے ناراضی کا اظہار کیا تھا سوراجی فریق جو کونسلوں میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر جگہ رخنے ڈال رہا تھا تاکہ دستور آگے نہ بڑھ سکے۔ بنگال اور صوبہ متوسط میں چند روز کے لئے دستور معطل کرنا پڑا مگر لارڈ ریڈنگ کے عہد میں کسی تبدیلی کی نوبت نہیں آئی۔

لارڈ ریڈنگ کے بعد لارڈ ارون کو جو انگلستان کے بڑے معزز زمیندار خاندان کے فرد ہیں وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء اپریل کے مہینے میں اپنی خدمت کا جائزہ لیا انہیں کے عہد میں اصلاح دستور کی بڑے پیمانے پر کوششیں شروع ہوئیں۔ اگرچہ اس وقت ترک موالات کی تحریک تو ٹھنڈی پڑ گئی تھی کیونکہ اس زمانے میں گاندھی جی کھدر کے پرچار اور ہریجنوں کی اصلاح میں مصروف تھے۔ لیکن ہندو مسلم فساد نہایت شدت سے ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں لاہور ملتان۔ بہار۔ ناگپور میں سخت بلوے ہوئے جن سے جان و مال کا بہت نقصان ہوا اس قومی منافرت کو دور کرنے کی بہترین کوشش کی گئی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا ۱۹۲۷ء میں وزیر ہند نے اس بات کا اعلان کیا کہ اصلاح دستور پر غور کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوئی ہے جو سات اراکین پر مشتمل ہے اور اس کے صدر سر جان سیمن ہیں۔ یہ کمیشن ۱۹۲۸ء فروری کے مہینے میں ہندوستان آئی۔ ہندوستانیوں کو اس کمیشن سے بڑی شکایت تھی۔ اول تو اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو نہیں رکھا گیا تھا۔ اس میں سب انگریز تھے۔ یہ خیال تھا کہ ایسی کمیشن جس میں کوئی ہندوستانی نہ ہو وہ ہندوستان کی قسمت کا کیا فیصلہ کر سکتی ہے۔ دوسرے اس کمیشن کے آنے سے پہلے مس میو نامی ایک امریکن عورت نے "مدر انڈیا" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر سخت حملے کئے تھے۔ اس سے انگریزوں کے خلاف قومی منافرت بہت بڑھ گئی ہندوستانیوں نے سیمن کمیشن سے میل ملاپ کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی زمانے میں مدراس میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو اس نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ سیمن کمیشن سے کوئی تعاون نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد ایک کل فریق کانفرنس اس غرض سے منعقد کی گئی کہ ہندوستانی خود اپنا دستور آپ مرتب کریں چنانچہ دستور کا ایک مسودہ مرتب

کرنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ یہ مسودہ نہرو رپورٹ کہلاتا ہے جو ۱۹۲۸ء جون کے مہینے میں شائع ہوا۔ اس میں قلمروی حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اگست کے مہینے میں کل فریق کانفرنس منعقد ہوئی اور اس نے یہ رپورٹ منظور کر لی۔ گو بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کامل خود مختاری چاہتے تھے۔ نیز مسلمانوں نے بھی اس سے اتفاق نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے قائد محمد علی جناح نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے ۱۴ نقاط پیش کر دیے۔

ہندوستان کی اس عام ناراضی سے حکومت خائف ہو گئی اور اس غلطی کو محسوس کر لیا کہ سیمن کمیشن میں ہندوستانی شریک نہیں کئے گئے۔ ہندوستانیوں کو ہموار کرنے کی یہ صورت تھی کہ گول میز کانفرنس کر کے اس میں ہندوستانی شرکا سے مشورہ کیا جائے۔ اس غرض کے لئے لارڈ ارون انگلستان گئے اور وزیر ہند اور دیگر ارباب سیاست سے مشورہ کر کے حکومت کا آئندہ مسلک معین کیا۔ دوسرے الفاظ میں ۱۹۲۹ء سے حکومت نے اپنا نقطۂ نظر و مسلک بالکل بدل دیا۔ لارڈ ارون نے ہندوستان آکر یہ اعلان کیا کہ انگلستان میں گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی اور اس میں ہندوستانی شریک کئے جائیں گے۔ اور اسی سنہ میں ۳۱ اکتوبر کو مزید اعلان یہ ہوا کہ حکومت کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان کو قلمروی درجہ دیا جائے۔ یہ الفاظ بہت پریشان کن تھے۔ ہندوستانیوں نے یہ سمجھا کہ انھیں وہ سیاسی درجہ دیا جائے گا جو کنیڈا اور آسٹریلیا کو حاصل ہے لیکن بعد کے بیانات سے معلوم ہوا اس درجے کی امید رکھنا بالکل بے معنی ہے۔ حکومت اس موقع پر یہ درجہ دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس مایوسی کی وجہ سے ہندوستانیوں کے خدمات میں ایک ردعمل شروع ہو گیا۔ دسمبر کے مہینے میں گاندھی جی کی لارڈ ارون سے ملاقات ہوئی تو اس میں گاندھی جی نے وائسرائے سے یہ صریح وعدہ چاہا کہ گول میز کانفرنس ہندوستان کے لئے قلمروی درجہ معین کر دے۔ لیکن وائسرائے ایسا وعدہ نہیں کر سکتے تھے بنگال اور ہندوستان کے بعض حصوں میں دہشت انگیزی شروع ہو گئی یعنی ہندوستانی انگریزوں کو مارنے لگے اور گاندھی جی نے نہ صرف حکومت سے اتحاد عمل کرنے سے انکار کر دیا بلکہ سول نافرمانی شروع کر دی۔ انھوں نے ساحلی مقامات پر قانون نمک کے خلاف نمک بنانا شروع کیا۔ پہلے تو حکومت نے اس سے چشم پوشی کی لیکن جب یہ معاملہ بہت آگے بڑھنے لگا تو گاندھی جی اور سب ان کے شرکا قید میں ڈال دیے گئے۔

گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ کانگریس نے تو اس میں شرکت نہیں کی تھی صرف اعتدال پسند ہندوستانی اراکین اور ہندوستانی رئیسوں نے اس میں شرکت کی۔ ملک معظم نے اس کا افتتاح کیا اور وزیر اعظم نے اس کی صدارت کی تھی۔ اس میں دوسرے امور کے ساتھ وفاقی مسئلے پر غور کیا گیا۔ روسائے ہند نے شرکت وفاق سے اتفاق کیا۔ چند کمیٹیاں بنائی گئیں جو ان امور پر غور کر کے رپورٹ پیش کریں۔ چونکہ مسائل بہت پیچیدہ تھے اس لئے مزید رائے عامہ حاصل کرنے کے لئے کانفرنس برخاست کر دی گئی۔ اس وقفے میں جب ہندوستانی اراکین ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے حکومت اور کانگریس میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی اور لارڈ ارون خود چاہتے تھے کہ کانگریس سے سمجھوتہ ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ ملک میں سول نافرمانی جاری تھی اور گاندھی جی اور ان کے رفقائے کار کی گرفتاری سے اس کا سدباب نہیں ہوا تھا۔ سمجھوتے کے لئے گفت وشنید شروع ہوئی۔ گاندھی جی اور چند کانگریسی علمبرداروں کو قید سے رہا کر دیا گیا۔ ۳۱/ مارچ ۱۹۳۱ء کو لارڈ ارون اور گاندھی جی کے مابین ایک میثاق ہو گیا جو "گاندھی ارون" میثاق کہلاتا ہے۔ اس میں وائسرائے نے کانگریس کی چند شرطیں منظور کر لیں کہ کانگریس کے دستوری مطالبات پر غور کیا جائے گا۔ بعض سیاسی قیدی رہا کر دیے جائیں گے جو کسی کی اجازت ہوگی۔ اس کے عوض میں گاندھی جی نے سول نافرمانی بند کر دی اور آئندہ گول میز کانفرنس میں شریک ہونا منظور کر لیا۔

۱۸/ اپریل ۱۹۳۱ء کو لارڈ ارون اپنی خدمت سے علیحدہ ہوئے اور لارڈ ولنگڈن نے جو انگلستان کے عمر رسیدہ مدبر تھے اور اس سے پہلے ہندوستان کے دو صوبوں کی گورنری کر چکے تھے خدمت کا جائزہ لیا۔ ستمبر کے مہینے میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوی۔ گذشتہ میثاق کے مطابق گاندھی جی نے بھی اس میں شرکت کی۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے انگلستان کی وزارت بدل گئی تھی یعنی اب بجائے لیبر وزارت کے ایک قومی وزارت برسر حکومت تھی جس میں قدامت پسندوں کا عنصر غالب تھا۔ اس کی وجہ سے حکومت انگلستان کا نقطۂ نظر بدل گیا اور لیبر وزارت سے جو امیدیں تھیں وہ اب باقی نہ تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحفظات اور چھوٹے طبقوں کے مسئلے میں بڑی الجھنیں پڑ گئیں ہر طبقے نے اپنے جداگانہ حقوق طلب کئے ہریجنوں نے عام ہندوؤں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس بات پر زور دیا کہ ان کا حلقۂ انتخاب جداگانہ ہونا چاہیئے۔ گاندھی جی اس کے لئے راضی نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے

ہریجنوں کے جداگانہ انتخاب کی سخت مخالفت کی اور کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا اور یہ ناراض ہندوستان واپس آ گئے۔ لیکن ہریجن بھی ان سے ناراض ہو گئے اور ہندوستان میں بڑا شور مچایا۔ اس کے علاوہ کانگریس اور حکومت کے تعلقات پھر کشیدہ ہو گئے کیونکہ گول میز کانفرنس کی تجاویز سے گاندھی جی کو اتفاق نہیں تھا اور وہ ناراض واپس آئے تھے۔ اس طرح گاندھی ارون میثاق ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس نے پھر اپنا مخالفانہ رویہ اختیار کر لیا۔ لارڈ ولنگڈن نے اپنے پیشروؤں سے زیادہ کانگریس کی مزاحمت کی متعدد تعزیری احکام نافذ کر دیے۔ کانگریس کی ہر تنظیم کو غیر قانونی قرار دیا اور کانگریس کے تمام رہنما گرفتار کر لئے گئے۔ گاندھی جی بھی پھر ۱۹۳۲ء کے اوائل میں قید میں ڈال دیے گئے۔ اس طرز عمل سے سیاسی فضا چند دنوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ کیونکہ ایک طرف کانگریس کے تمام مرکز اور اس کا مالیہ ضبط ہو گیا تھا اور دوسرے عوام بھی ہڑتال اور سول نافرمانی سے بیزار ہو گئے تھے۔ چھوٹے طبقے جن میں ہریجنوں کا طبقہ بھی شامل ہے گاندھی جی کے طرز عمل سے بدظن ہو گیا تھا۔

اِسی اثنا میں انگلستان کے وزیر اعظم نے نشستوں کی تقسیم کا اعلان کیا یعنی قانون ساز مجلسوں میں ہر طبقے کو خاص نشستیں دی گئیں اور ہر طبقے کا جداگانہ انتخاب قرار دیا۔ اس میں ہریجنوں کا بھی جداگانہ انتخاب قرار دیا گیا جو ابتک نہیں تھا۔ اور اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ خود کانفرنس کے اراکین اس مسئلے پر اتفاق نہیں کر سکے۔ لیکن ہریجنوں کے جداگانہ انتخاب سے ہندو قومیت پر بڑی ضرب لگ گئی کیونکہ ہریجنوں کے علٰحدہ ہو جانے سے ہندوؤں کی کثرت باقی نہیں رہتی۔ اس فیصلے سے گاندھی جی جو اس وقت پونا سے قریب برواد اجیل میں قید تھے بگڑ گئے اور قید خانے سے یہ اعلان کیا کہ اگر یہ فیصلہ منسوخ نہیں ہوگا تو میں فاقے کر کے اپنے کو ہلاک کر دوں گا۔ جب حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی تو انھوں نے ۲۰/ستمبر ۱۹۳۲ء کو اپنا برت شروع کر دیا۔ اس سے ملک میں بڑی ہلچل ہوگئی اور اہل ملک نے گاندھی جی کو موت سے بچانا ضروری سمجھا۔ حکومت تو اپنے فیصلے کو بدلنے کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن ہریجنوں کے رہنما ڈاکٹر امبیڈکر کو سمجھایا گیا کہ وہ جداگانہ انتخاب سے باز آئیں۔ بڑی گفت و شنید کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہریجنوں کا دوبارہ انتخاب ہوا کرے۔ پہلے تو وہ خود اپنی جماعت میں اپنا آپ انتخاب کریں اور اس کے بعد عام ہندوؤں کے ساتھ ان کا انتخاب ہو۔ اس سمجھوتے کو "میثاق پونا" یا "میثاق یرودا" کہتے ہیں۔

اس سمجھوتے کے بعد گاندھی جی نے ۲۶ / ستمبر کو اپنا برت توڑ دیا اور حکومت نے بھی اس فیصلے کو تسلیم کرلیا۔ اگرچہ ہریجنوں سے ایک سرسری سمجھوتہ تو ہو گیا تھا لیکن معاشرتی اختلافات جوں کے توں باقی تھے اس لئے اس کے بعد گاندھی جی نے اس بات کی پر زور کوشش شروع کردی کہ معاشرتی بندھنوں کو توڑ کر اچھوتوں کو عام ہندوؤں کے برابر کردیں۔ اس کو ہریجن تحریک کہتے ہیں یہ اب برابر جاری ہے۔

۱۷/ نومبر ۱۹۳۲ء کو گول میز کانفرنس کا تیسرا اجلاس ہوا جو بہت مختصر تھا۔ اس میں کانگریس کی نمائندگی نہیں ہوئی اسی کانفرنس نے باقی ماندہ امور پر غور کیا۔ اس سے پہلے تفصیلی امور پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان کی روادیں پیش ہوئیں اور آخری فیصلے ہوئے۔ اس کانفرنس کے برخاست ہونے کے بعد انگلستان کی حکومت نے ان تینوں کانفرنسوں کی تمام کارروائیوں اور فیصلوں کی روشنی میں اپنی تمام تجاویز مرتب کیں اور ان کو ۱۹۳۳ء مارچ کے مہینے میں عوام کے معلومات کے لئے شائع کیا جس کو "کاغذ ابیض" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ان تجاویز کی آخری جانچ پڑتال کرنے اور اس کو مسودے کی شکل میں مرتب کرنے کیلئے ایک مشترک پارلیمانی کمیٹی مرتب کی گئی جس میں دار العوام اور دار الامرا کے اراکین شریک کئے گئے یعنی اس میں ہر ایوان کے ۱۶ اراکین تھے۔ اس کمیٹی نے پچھلی تجویزوں میں ضروری ترمیمیں کیں اور ۲۲/ نومبر ۱۹۳۴ء کو اپنی رپورٹ شائع کی۔ اسی رپورٹ کی روشنی میں مسودۂ حکومت ہند مرتب کیا گیا اور ۱۹۳۵ء ۵ فروری کو یہ دار العوام میں پیش ہوا چونکہ اس میں بیشمار دفعات تھیں اس لئے دار العوام کی پہلی خواندگی کے بعد ایوان کی کئی کمیٹیاں بن گئیں اور ہر مضمون پر الگ الگ غور کیا گیا۔ جب یہ دار العوام سے پاس ہو گیا تو ۶/ جون کو یہ دار الامرا میں پیش کیا گیا اور دوسری اگست کو اس مسودے پر بادشاہ کے دستخط ہو گئے اور اس طرح یہ قانون کی صورت میں پاس ہو گیا جو قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کہلاتا ہے۔ یہ سب سے بڑا قانون ہے اور اس میں ۴۷۸ دفعات ہیں۔

جس زمانے میں قانون حکومت ہند پاس ہو رہا تھا کانگریس پوری مخالفت پر آمادہ تھی ۱۹۳۴ء مارچ کے مہینے میں کلکتے میں جو کانگریس منعقد ہوئی تھی اس نے اعلان کیا کہ وہ انگریزوں کے بنائے ہوئے قانون کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بمبئی کے مہینے میں

گاندھی جی نے ہریجنوں کے خاطر ایک اور برت شروع کیا۔ اس برت سے ڈر کر کہ یہ ہلاک نہ ہو جائیں حکومت نے انھیں آزاد کر دیا۔ قید سے رہا ہو کر گاندھی جی نے نافرمانی کی تحریک چند روز کے لئے ملتوی کر دی تاکہ ہریجنوں کے معاملے میں زیادہ توجہ ہو سکے۔ اس کے بعد پونا میں کانفرنس ہوئی اور اس میں یہ تحریک بالکل مسدود کر دی گئی لیکن یہ کہا گیا کہ اگر کوئی شخص انفرادی طور پر اس میں حصہ لینا چاہے تو وہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے خود اپنے طور پر سول نافرمانی شروع کر دی اور اگست کے مہینے میں خود پیشقدمی کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر قید میں ڈال دیے گئے۔ لیکن ان کے قید کے بعد ہر صوبے میں یہ تحریک نافرمانی انفرادی طور پر جاری رہی اور قید ہونے کے چند روز کے بعد ہی گاندھی جی نے پھر برت شروع کر دیا۔ حکومت نے خائف ہو کر ان کو پھر رہا کر دیا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد گاندھی جی نے نافرمانی بالکل مسدود کر دی تاکہ وہ آزاد رہیں اور ملک کو ضروری مشورہ دے سکیں اور ہریجن تحریک کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے اور ان اغراض کے لئے ہر صوبے میں دورہ کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۴ء اگرچہ یہ تحریک نافرمانی مسدود ہو گئی تھی لیکن کانگریس نے قانون حکومت ہند سے اتفاق نہیں کیا۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں جو کانگریسیں منعقد ہوئیں انھوں نے قانون کی مخالفت کی اسی دوران میں جبکہ قانون ہند پاس ہو رہا تھا ہندوستان کے دو صوبوں میں ایک بڑی مصیبت آئی۔ ۱۹۳۴ء کے اوائل میں بہار میں اور ۱۹۳۵ء کے وسط میں کوئٹہ میں بڑے زلزلے ہو گئے اور صدہا آدمیوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ گو حکومت کی مصلحت یہ تھی کہ کانگریس کو بہار اور کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی براہ راست امداد سے روکا جائے لیکن کانگریس نے ان کی امداد کے لئے روپیہ بہت جمع کیا اور مصیبت زدوں کی مالی امداد کی۔

۱۹۳۶ء اپریل کے مہینے میں لارڈ ولنگڈن کی میعاد ملازمت ختم ہوئی جس وقت یہ وائسرائے ہندوستان آئے تھے ملک کے سیاسی حالات بہت دگرگوں تھے۔ سول نافرمانی کا زور تھا۔ کانگریس حکومت کے ساتھ اتحاد عمل کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں سیاسی فضا بالکل خاموش تھی۔ خود کانگریس نے سول نافرمانی بند کر دی اور دوسرے تعمیری کام یعنی اچھوت سدھار۔ دیہات سدھار وغیرہ کے طرف ہمہ تن مصروف ہو گئی اور یہ کام اس وقت بہت ضروری سمجھے گئے اور جب صوبوں میں

۱۹۳۶ء ماہ اپریل سے قانون حکومت ہند کا نفاذ ہوا تو پہلے کانگریس نے عہدے قبول کرنے سے انکار کردیا اور کام چلانے کے لئے عارضی وزارتیں بنائی گئیں لیکن بعد کو کانگریس نے اس بات کا فیصلہ کرلیا کہ عہدے قبول کرنے چاہئیں چنانچہ جن صوبوں کی مجلسوں میں کانگریسی اراکین کی کثرت ہے وہاں کانگریسی وزیر کام کر رہے ہیں۔ لارڈ لنلتھگو جو انگلستان کے بڑے زمیندار امیر گھرانے کے آدمی ہیں ۱۹۳۶ء میں وائسرائے کی خدمت پر بھیجے گئے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے صوبوں میں قانون حکومت ہند کا نفاذ ہوچکا تھا۔ اب اس بات کی کوشش ہے کہ قانون حکومت ہند کے دوسرے حصے بھی نافذ کئے جائیں یعنی وفاق کا انتظام ہو اور مرکزی حکومت میں تبدیلی ہو۔ لیکن مشکل ہے کہ نہ صرف دیسی رئیس بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے طبقے مجوزہ وفاق کے مخالف معلوم ہوتے ہیں اور حکومت ان کو راضی کرنا چاہتی ہے موجودہ وائسرائے کو دیہات سدھار سے بہت دلچسپی ہے۔ یہ خود دیہات کا دورہ کرتے ہیں۔ گاؤں والوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرتے ہیں۔ مویشی کی ترقی کو خاص طور پر پیش نظر رکھتے ہیں۔

باب ۶

تعلیم و تمدن و اصلاحات

پہلی فصل :- جدید تعلیم و تمدن

گزشتہ ایک صدی میں انگریزوں کی حکومت سے اہل ہند کے افکار و اخلاق اور تمدن و معاشرت میں بڑا انقلاب ہو گیا ہے۔ اس پر مفصل و جامع بحث کرنے کے لئے مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم ہندوستان کی تاریخ میں اس انقلاب کے اہم اسباب اور نمایاں اثرات پر ایک اجمالی نظر ڈالنی ضرور ہے اور ان اسباب میں اہل ہند کے اندرونی تغیر کا سب سے قوی سبب جدید یا مغربی تعلیم کو سمجھنا چاہئے۔

انگریزی تعلیم کی ابتدا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور حکومت میں انگریزی حکام کو اپنی ہندی رعایا کی تعلیم پر کوئی توجہ نہ تھی خاص کر انگریزی تعلیم کی اشاعت کو تو وہ مصلحت کے بالکل خلاف اور لوگوں کے مذہبی اشتعال کا موجب جانتے تھے چنانچہ عیسائی پادریوں نے بطور خود انگریزی زبان اور عیسائی مذہب کی تعلیم کے مدرسے جاری کئے تو ان کی بھی کمپنی کی طرف سے اوّل اوّل مخالفت کی گئی اور پادریوں کا پہلا کالج سیرامپور میں قائم ہوا جہاں اس وقت ڈنمارک والوں کا عمل دخل تھا۔

۱۸۱۳ء (۱۲۲۷ھ) میں سرکاری طور پر ایک لاکھ روپیہ سالانہ "اہل ہند میں علوم کی احیا اور ترقی" کے واسطے دیا جانا منظور کیا گیا تھا لیکن یہ رقم تمام و کمال مشرقی علوم (بالخصوص مذہبی قوانین کی تعلیم) یا دیسی زبانوں کی سرپرستی میں صرف ہوتی رہی حتیٰ کہ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں (لارڈ) مکالے "مجلس نظارت تعلیم" کا صدر نشیں ہوا اور اس نے

باب ۲

مشرقی تعلیم یا تصانیف پر سرکاری روپیہ خرچ کرنے کی سخت مخالفت کی۔ انگریزی تعلیم کی تاریخ میں مکالے کی وہ "یادداشت" مشہور ہے جس میں اس نے عربی و سنسکرت علوم اور دیسی زبانوں کی کتابوں کا خاکہ اڑایا ہے۔ لیکن مکالے کو اپنے مقصد میں جو کامیابی ہوئی اُس کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسی زمانے میں پارلیمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی توانین نافذ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مشرقی علوم کی تحصیل پر اب تک جو کچھ زور دیا جاتا تھا اس کی بنا یہی تھی کہ اس وقت تک کمپنی کی عام دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں قدیم دستور کے مطابق اسلامی فقہ اور ہندو شاستروں کی رُو سے مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا، اور ان مذہبی قوانین کی تعلیم و واقفیت کے لئے عربی اور سنسکرت کا پڑھنا لازمی تھا۔ مگر جب انگریزی قوانین جاری ہوے اور فقہ و شاستر کی ضرورت بہت کم رہ گئی تو عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی چنداں ضروری نہ رہا۔ غرض مکالے کی کوشش کارگر ہوئی اور اگرچہ علوم مشرقی کے دو سرکاری مدرسے جو پہلے سے قایم تھے اُسی طرح جاری رہے لیکن گورنر جنرل کی کونسل نے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ آئندہ سرکار کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی اشاعت کا کام اپنے ذمّے لینا چاہئے۔ پھر بنگال، مدراس اور بمبئی میں اعلیٰ تعلیم کے کئی اسکول اور کالج جاری کئے گئے اور شمالی ہند کے بعض حصّوں میں ابتدائی تعلیم پر بھی توجہ کی گئی اگرچہ عام طور پر انگریز حکام اس کی وسیع ذمہ داری لیتے ہچکچاتے تھے۔

"وڈ کا تعلیمی مراسلہ"

کونسل کے مذکورہ بالا فیصلے کے بعد بھی کئی سال تک تعلیم کی رفتار بہت سست رہی، چنانچہ ۱۸۵۳ء (۱۲۶۹ھ) میں کل چودہ سرکاری اسکول اور کالج جاری ہوے جن میں طالبعلموں کا شمار چالیس[?] ہزار سے بھی کم تھا[۵۱] بایں ہمہ پادریوں کی کوشش اور سرکاری ملازمت ملنے میں آسانی کی وجہ سے اول تو اہل ہند میں انگریزی سیکھنے کا شوق روز افزوں ترقی کر رہا تھا، دوسرے خود انگریز حکّام کو بھی انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے انتظامی کاموں میں مدد ملنے لگی تھی۔ یہ اور بعض دیگر وجوہ نے آخر سرکار کو انگریزی تعلیم کی مزید اشاعت و ترویج پر آمادہ کر دیا اور اس مرتبہ خود نظمائے کمپنی کی جانب سے ایک مبسوط تحریری تجویز گورنر جنرل کے نام بھیجی گئی جو "وڈ کے تعلیمی مراسلے ۱۸۵۴ء" کے نام سے مشہور ہے[۵۲]

۵۱۔ گزیٹیر۔ جلد چہارم صفحہ ۴۱۲۔

۵۲۔ سر چارلس وڈ جو بعد میں لارڈ ہے لی فیکس کے خطاب سے مشہور ہوئے، اس زمانے میں نظمائے کمپنی کی

اس مراسلے میں ہدایت کی گئی تھی کہ آیندہ ہندوستان کے ہر احاطے میں ایک علیحدہ محکمۂ تعلیمات قائم کیا جائے اور ان کے صدر مقامات پر ایک یونیورسٹی بنادی جائے۔ موجودالوقت انگریزی اسکول اور کالجوں کی تعداد میں جس حد تک مناسب ہو اضافہ کیا جائے اور تحتانی یا ابتدائی مدارس کی اس طریق پر اصلاح اور نگرانی کی جائے کہ اُن کے تعلیم یافتہ طلبہ بہ آسانی فوقانی مدارس میں داخل ہو سکیں۔ ان اعلیٰ مدارس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان کو قرار دیا گیا اور ادنیٰ مدارس میں بھی جہاں مانگ ہو انگریزی سکھانے کا انتظام کرنے کی سفارش کی گئی۔ مراسلے میں ایسے خانگی مدارس کو امداد دینے کی بھی تحریک تھی جو اپنے نصابِ تعلیم اور عام تعلیمی اصول میں سرکار کی نگرانی اور مشورہ قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔

بعد کی تاریخ

مذکورۂ بالا تجاویز کے مطابق ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم کردی گئی تھیں لیکن ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور بعد میں بعض مالی مشکلات کی وجہ سے کئی سال تک انگریزی تعلیم زیادہ ترقی نہ کرسکی البتہ ۱۸۷۰ء سے اس کی رفتار میں نمایاں تیزی نظر آتی ہے۔ یعنی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اعلیٰ تعلیم کے کالج کھل رہے ہیں اور بہ مشکل کوئی بارونق قصبہ یا تحصیل کا مقام ایسا ہوگا جہاں انگریزی تعلیم کے وسطانی (مڈل) یا فوقانی (ہائی اسکول) مدرسے جاری نہ ہو گئے ہوں۔ ابتدائی تعلیم کو بڑی ترقی اس وقت ہوئی جب کہ اس کا انتظام مقامی بلدیات کے حوالے کیا گیا اور ان بلدیات کو تعلیمی مصارف کے واسطے چُنگی کا محصول وصول کرنے کی اجازت مل گئی۔

۱۸۸۰ء (۱۲۹۶ھ) میں انگریزی کالجوں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ اور ان میں تعلیم پانے والے تقریباً ۶ ہزار تھے۔ پھر جب اسی زمانے میں ایک علیحدہ پنجاب یونیورسٹی (۱۸۸۲ء) اور الہ آباد یونیورسٹی (۱۸۸۷ء) قائم ہوئی تو شمالی ہند میں اعلیٰ تعلیم کی ترویج میں اور بھی آسانیاں ہوگئیں۔ دوسرے یہی زمانہ ہے جس میں مسلمانوں نے مغربی علوم سیکھنے پر توجہ کی۔ مذہبی تعصبات کی بناء پر وہ اب تک انگریزی مدرسوں میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۸۳۶ء (۱۲۵۱ھ) میں حاجی محمد محسن کے مذہبی وقف سے ہگلی میں ایک انگریزی کالج

بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ:— مجلس نظارت کے ممبر مجلس تھے۔ مذکورۂ بالا تعلیمی مراسلہ نیز مکالے کی یادداشت حال میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ از سرِ نو شائع کردی گئی ہے (دیکھو رپورٹ جلد چہارم ضمیمہ دوم وسوم)

قائم کیا گیا تھا لیکن ۱۸۵۰ء تک کل چار سو طلبہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ تھی[۱]۔
مسلمانوں کے تعصبات دور کرنے کی سرکار انگریزی (خاص کر لارڈ میو) نے بھی کوشش کی اور اس میں ڈاکٹر سر سید احمد خاں بانی مدرسۃ العلوم (بناء ۱۸۷۵ء) علی گڑھ کی کوششوں سے بہت کچھ کامیابی ہوئی کہ رفتہ رفتہ شمالی ہند کے مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہو گئے۔ بایں ہمہ سرکار کی خاص مراعات اور بعض لوگوں کی ذاتی کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ اس میدان میں اپنے ہندو ہموطنوں سے پیچھے ہیں۔
بیچ کے دنوں میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے جس بلند آہنگی سے اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا، اس نے بہت سے انگریز حکّام کو اس طریق تعلیم سے بدگمان کر دیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ابتدا میں انگریزی تعلیم کو رواج دینے کی بڑی غرض یہ تھی کہ سرکار کو انگریزی داں ہندوستانی ملازمین ملنے میں سہولت ہو۔ لیکن انگریزی مدارس اور طلبہ میں جس تیزی سے اضافہ ہوا تھا اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صدہا نئے تعلیم یافتہ ملازمت سے محروم رہنے لگے لہذا اگر اُن کے ایک گروہ نے "سیاسی شورش" کو اپنا مشغلہ بنا لیا تو اس میں کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ مگر انگریزی تعلیم کے اس رواج عام کو روکنے کی اگر سرکار کی طرف سے کوئی کوشش کی بھی گئی تو وہ چنداں کامیاب نہ ہوئی اور مجموعی طور پر سرکاری مدارس اور تعلیمی مصارف میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ خانگی اور ابتدائی مدارس کو چھوڑ کر آج کل (انگریزی علاقے میں) صرف سرکاری کالجوں اور ثانوی مدارس کی تعداد ۸ ہزار کے قریب ہے جس میں تقریباً بارہ لاکھ ہندوستانی طلبہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ڈھاکہ، پٹنہ وغیرہ مقامات میں نئی یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں۔ اور ہندو اور مسلمانوں نے مخصوص تعلیمی ضروریات کو

[۱] رپورٹ کلکتہ کمیشن۔ جلد چہارم صفحہ ۲۴۷۔ اس جگہ یہ صراحت کر دینی مناسب ہوگی کہ حاجی محمد محسن کا خاندان ایران سے آکر بنگالے (ہگلی) میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ نہایت دولتمند تاجر تھے اور انھوں نے وفات سے کچھ پہلے اپنی تمام جائداد مذہبی کاموں کے لئے وقف کر دی تھی (۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء) لیکن چند سال کے بعد متولیوں کی بدنظمی اور خیانت کی شکایت پر سرکار انگریزی نے اس جائداد کو جس کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب تھی اپنی تحویل میں لے لیا اور بہت دن تک یہ روپیہ عام تعلیمی اغراض میں صرف ہوتا رہا۔ لیکن اب زیادہ تر غریب مسلمانوں کے تعلیمی وظائف اور مدارس کی امداد کے کام میں آتا ہے۔

پیش نظر رکھکر بنارس اور علی گڑھ میں اپنی اپنی یونیورسٹیاں علٰحدہ بنائی ہیں۔ ابھی حال میں دہلی اور آگرے کی دو جامعات علٰحدہ قائم ہوگئیں اور جنوب میں ناگپور۔ آندھرا اور انامِلائے یونیورسٹی قائم ہوئی۔ مگر مغربی علوم کی تاریخ میں سب سے دلچسپ اور جدید تجربہ وہ ہے جس نے ریاست حیدرآباد میں جامعۂ عثمانیہ کی صورت اختیار کی۔ اور سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے قرار دیا کہ اس یونیورسٹی میں علوم مغربی کی اعلیٰ تعلیم "ہندوستانی" زبان کے ذریعے دی جائے۔

مطابع اور السنۂ ہند

مغربی علوم کی تشویق و ترویج میں سرکاری مدارس اور پادریوں کی کوشش کے علاوہ سب سے زیادہ مدد جدید مطابع اور دیسی زبانوں کی نئی کتابوں اور اخبارات سے ملی۔ نئے قسم کے چھاپے خانے کو سب سے اول پادری ہندوستان لائے تھے پھر اٹھارھویں صدی میں سرکاری ضرورتوں کے واسطے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں انگریزی مطابع قائم ہوئے۔ لیکن سب سے پہلا (غیر سرکاری) اخبار جو ہندوستان میں (کلکتے سے) جاری ہوا "بنگال گزٹ" تھا (۱۷۸۰ء ۱۱۹۳ھ) اس انگریزی اخبار کے اڈیٹر مسٹر ہلی کو وارن ہیسٹنگز کی ہجو کے خلاف مضامین لکھنے کی سزا میں کئی سال کی قید ہوئی اور اس کے جانشین "انڈین گزٹ" کے اڈیٹر کا بھی اسی قسم کا حشر ہوا۔ ان نوخیز اخبار والوں کی دریدہ دہنی سے تنگ آکر ولزلی کے عہد میں اخبارات کی آزادی پر سخت قیود عائد کردی گئی تھیں مگر سر چارلس مٹکاف کے زمانے (۱۸۳۵ء ۱۲۵۰ھ) میں ان قیود کو فی الجملہ کم کردیا گیا۔

دیسی زبانوں کے اُبھرنے اور تحریری زبان بننے کا بھی زمانہ یہی ہے اور کم سے کم نثر اردو کا تو بانی مبانی انگریزوں کو سمجھنا چاہئے۔ اردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں (آرائش محفل، باغ و بہار وغیرہ) انھی کی سرپرستی میں کلکتے سے شائع ہوئیں اور آہستہ آہستہ فارسی کی بجائے ہندوستانی نیز دوسری دیسی زبانیں "سرکاری زبان" قرار دی جانے لگیں۔ دیسی زبان (بنگالی) کا پہلا اخبار "سماچار درپن" سیرامپور سے مسیحی پادریوں نے ۱۸۱۸ء میں جاری کیا۔ مگر سیسے کے حروف سے اردو تحریر کی کتابیں چھاپنے میں بہت خرچ ہوتا تھا۔ لہٰذا اس زبان کے نئے جراید و کتب کی ترقی کا زمانہ ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) سے شروع ہوتا ہے جب کہ دہلی میں (لیتھو) پتھر کا پہلا مطبع قائم ہوا اور تھوڑے دن بعد غالباً وہیں سے اردو زبان کا پہلا اخبار نکلا[۱]۔

[۱] ۔ حال میں دیسی جرائد کی تعداد میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ "جنگ یورپ" سے پہلے اخبارات و رسائل کی کل تعداد

۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے "دیسی اخبارات" کی آزادی روکنے کے لئے بہت سی قیود بڑھا دیں۔ مگر لارڈ رپن نے انھیں منسوخ کر دیا۔ اور پھر اس قسم کے قوانین ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء میں نافذ ہوئے جن سے اخبارات کی آزادی روکنے کے معاملے میں انتظامی عہدہ داروں کے اختیارات بہت بڑھ گئے اور انھیں اس بات کی اجازت مل گئی کہ بغیر عدالتی مقدمہ کئے؛ وہ مشتبہ مطابع کو ضبط اور اخبارات کو بند کر سکتے ہیں، یہ "قوانین مطابع" عام تھے مگر ان کی زد میں زیادہ تر دیسی مطابع اور ہندوستانیوں ہی کے جرائد آئے؛ حال میں (۱۹۲۱ء) سرکار کی طرف سے اہل الرائے کی ایک جماعت ان قوانین پر غور کرنے کے واسطے متعین ہوئی تھی اور اسی کی سفارش سے مذکورۂ بالا قیود کو ایک حد تک دور کر دیا گیا ہے۔

انقلاب تمدن کے دیگر اسباب

مغربی علوم کی اشاعت کی طرح۔ انگریزوں کے ساتھ میل جول اور مغربی تمدن کی ترویج نے اہل ہند کی معاشرت میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ کنکر یا روڑے کی پکی سڑکیں تو لارڈ ہیسٹنگز اور ایمہرسٹ ہی کے زمانے میں بننے لگی تھیں ڈلہوزی کے عہد میں ریلوں کا آغاز ہوا اور آئندہ پچاس برس میں ان کا ہزاروں میل کا جال تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ سیاحت و سفر کی آسانیوں کے ساتھ ان ریلوں کے ذریعے بیرونی تجارت کو نہایت فروغ ہوا اور یورپ کی مصنوعات ہندوستان کے گوشے گوشے میں ارزاں قیمت پر فروخت ہونے لگیں۔ تجارت درآمد کی حیرت انگیز ترقی کا سرسری اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ سنہ ۴۰ تا ۱۸۴۳ء میں اشیائے درآمد کی قیمت کا سالانہ اوسط پانچ کروڑ روپے سے کم تھا۔ مگر اب (جنگ یورپ سے پہلے یعنی ۱۹۱۴ء میں) سوا دو ارب روپے کے قریب پہنچ گیا ہے؛[1]

۱۸۶۹ء کے اواخر (۱۲۸۶ھ) میں خلیفہ ہارون الرشید کا خواب، حیز عمل میں آگیا ہے یعنی نہر سویز کی تیاری نے یورپ و ایشیا کے سمندروں کو ملا دیا[2] اور انگلستان سے ہندوستان تک جہازی سفر صرف اتنے دن کا رہ گیا جتنے دن میں پہلے دہلی سے برہانپور

بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ:- جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے شائع ہوتے تھے۔ ڈیڑھ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔

[1] "فنانشل اینڈ کمرشل اسٹیٹکس" مطبوعہ ۱۹۱۰ء۔ نیز دیکھو "اسٹیٹس مینز ایر بک ۱۹۱۹ء" وغیرہ۔

[2] اس تجویز کی گزشتہ تاریخ کے متعلق دیکھو "انسائی کلو، برٹ" جلد بست و ششم۔

یا اورنگ آباد پہنچا کرتے تھے! ادھر تار برقی اور بحری تار کے ذریعے ممالک بعید سے گھنٹوں میں ایک دوسرے کی خبریں ملنے لگیں اور سیاحت وسفر کی ان انقلاب انگیز سہولتوں نے مشرق ومغرب میں آمد ورفت کا راستہ کشادہ کر دیا۔ ہندوستان سے صدہا آدمی تعلیم وتجارت یا سیر وسیاحت کی غرض سے یورپ وامریکہ جانے اور وہاں کے آداب معاشرت اپنے ساتھ ہندوستان لانے لگے۔ یوں بھی حکمراں اور دولتمند قوم کی ہر ادا میں دلکشی ہوتی ہے اور ہندوستان کے قدیم رسوم وتمدّن کو توجہل، افلاس نے اور بھی بدنما کر رکھا تھا۔ غرض ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ لباس اور طعام ومکان اور سواری، نشست وبرخاست، رفتار وگفتار غرض ہر بات میں ہندوستان کے بہت سے لوگ خاص کر نئے تعلیم یافتہ، اہل یورپ کی تقلید کرنے لگے۔

افکار واخلاق

مگر طرز معاشرت کے ان تغیرات کے علاوہ ہندوستان والوں پر اہل یورپ کے خیالات کا بہت گہرا اثر ہوا۔ جس وقت انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت عام اہل ہند کی علمی اور اخلاقی حالت نہایت ابتر تھی۔ بے شبہہ دہلی، لکھنؤ، خیر آباد، جون پور وغیرہ بعض مقامات میں تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) تک بعض متبحر اسلامی علماء موجود تھے جن کے علم وفضل، صلاح وتقویٰ اور حکیمانہ تصانیف کی آج تک اسلامی دنیا میں گونج ہے لیکن اس زمانے میں ان بزرگوں کی تعلیم کا اثر بہت محدود ہو گیا تھا۔ عوام الناس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کے افراد کو بھی اپنے لغو مشاغل میں تحصیل علوم کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے اس بات کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ انگریزی تعلیم کو سب سے پہلے اُن لوگوں نے اپنی اولاد میں پھیلایا جو بالعموم مشرقی علوم سے بے خبر یا سطحی واقفیت رکھتے تھے۔ ورنہ کم سے کم مسلمان علماء اور جو لوگ ان کے اثر میں تھے، وہ عرصۂ دراز تک اپنی اولاد کو انگریزی زبان سکھانے سے اجتناب کرتے رہے۔

بہر حال، جب ایک گروہ کثیر مغربی علوم سے آگاہ ہوا تو اہل یورپ کی تصانیف، نئے خیالات، نئے انکشافات اور نئے طرز بیان میں جو دلفریبی ہے اُس نے بہتوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور جدید خیالات کے مقابلے میں قدیم فلسفہ اور ادب تقویم پارینہ نظر آنے لگے۔ نظم ونثر تحریر وتقریر اور ہر قسم کے علم وفن کے معاملات میں یورپ کی پیروی کی جانے لگی۔ اور جہاں یہ اثرات زیادہ پھیلے تھے وہاں لوگوں کے مذہبی عقائد

اور اخلاق میں بھی نمایاں تغیر ہوگیا جو موجودہ زمانے کے ارباب بصیرت کے سامنے ہے۔

دوسری فصل :- آئین واصول حکومت

لیکن کم وبیش ایک صدی کی انگریزی حکومت نے سب سے اہم انقلاب اہل ہند کے سیاسی خیالات میں پیدا کیا۔ دورِ قدیم سے قطع نظر جس کے سیاسی آئین کی کوئی واضح اور معتبر تاریخ موجود نہیں، ہندوستان میں سلاطین اسلامی کی سلطنت ایک جنگی حکومت کی نوعیت رکھتی تھی ایک جنگجو اور اولوالعزم سپاہی میں جو خوبیاں اور عیب ہوتے ہیں قریب قریب وہ سب مسلمانوں کے آئین حکومت میں نمایاں ہیں جیساکہ ہم اس کتاب کے پہلے حصوں میں جابجا اشارہ کر چکے ہیں، مسلمانوں کی ابتدائی سلطنت جمہوریت کے عناصر سے خالی نہ تھی لیکن اس کا زیادہ تر رجحان شخصی بادشاہی کی طرف تھا اور آخر میں سلاطین تیموریہ نے اسی شخصی طرز بادشاہی کو نہایت استحکام کے ساتھ ہندوستان میں قائم کیا، ان مغل بادشاہوں کے اعلیٰ اوصاف شاہانہ سے انکار نہیں اور اقتصادی اعتبار سے اُن کے عہدِ حکومت میں ہندوستان نہایت دولتمند وخوش حال رہا، لیکن اسی کے ساتھ عام رعایا اپنے مُلکی معاملات سے بالکل بے خبر اور سیاسی حقوق سے مطلقاً محروم ہوگئی۔ لوگوں کی شخصی اور مذہبی آزادی میں کوئی خاص مداخلت نہ کی جاتی تھی۔ وضع قوانین اور اپنے مقدمات کے تصفیل کرنے کا بہت کچھ دیہات کی پنچایتوں کو اختیار تھا۔ بایں ہمہ ملکی معاملات میں بادشاہ کی انفرادی رائے قول فیصل کا حکم رکھتی تھی اور اس کے احکام کے خلاف کسی کو لب کشائی کی مجال نہ تھی۔

ان آئین کے مقابلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت گویا تاجروں کی بادشاہی تھی اور اس میں تمام وہ محاسن و معائب موجود تھے جو کسی تجارتی کارخانے کی خصوصیات ہیں۔ کمپنی کے ملازموں نے اوّل اوّل اہل ہند سے ملک ومال لینے میں یا اپنے تجارتی فوائد کے لئے ہندوستانی مصنوعات اور تجارت کو نقصان پہنچانے میں جو جو زیادتیاں کی ہیں، ان کی تفصیل پڑھنی ہو تو ولیم ڈگبی دادا بھائی نوروجی مسٹر دت وغیرہ مشہور مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن میں بڑی عرق ریزی سے مذکورہ بالا "زرکشی" اور ہندوستان کے

روزافزوں افلاس کی شہادتیں، خود سرکاری بیانات اور مسلّمہ واقعات سے مہیّا کی گئی ہیں۔
لیکن یہاں خاص طور پر جو بات جتانی منظور ہے وہ یہ ہے کہ کمپنی کے عہدہ دار اہل ہند کے حق میں کیسے ہی استبداد پسند ہوں، خود ان کا نظامِ حکومت "اشتراکی" اور اس لئے ایک حد تک جمہوری تھا۔ اور وہ مِلکر کام کرنے کے اصول اور خوبیوں کو خوب سمجھتے تھے۔
دوسرے اٹھارھویں صدی عیسوی (بارھویں صدی ہجری) میں اہل یورپ کے سیاسی خیالات میں جو زبردست انقلاب پیدا ہوا اس کے اثر سے ہندوستان کے یہ نئے حکمران مستثنیٰ نہ تھے اور اپنی اغراض کی وجہ سے وہ اہل ہند کی آزادی کے کیسے ہی مخالف کیوں نہ ہوں، عام لوگوں کے سیاسی حقوق کا یقیناً گزشتہ بادشاہوں اور اُن کے امراسے زیادہ احساس رکھتے تھے۔
اس کے علاوہ انگلستان کی حکومت نے بھی کمپنی کے اختیارات میں وقتاً فوقتاً مداخلت کی اور جب کبھی بدعنوانیاں دیکھیں کمپنی کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کو حکومت کا صحیح راستہ معلوم ہو۔ چنانچہ ۱۷۷۳ء قانون تنظیمی اور ۱۷۸۴ء کے قانون ہندوستان کے علاوہ جو کمپنی کی سیاسی رہنمائی کے لئے بنائے گئے تھے ۱۸۳۳ء میں پھر اضافے کئے گئے اور قانون سازی کا انتظام کیا گیا۔ اور جب ۱۸۵۷ء کی شورش ہوئی تو کمپنی کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا اور ہندوستان کو براہِ راست تاج برطانیہ کے تحت لے لیا گیا۔

انگریزی فتح کی نوعیت

ایک اور اہم سبب جس کا آئینِ حکومت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا، یہ ہے کہ انگریزوں کا ممالک ہند پر تصرف و تسلّط عام فتوحات سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ تاریخ کے مشہور فاضل پروفیسر سیلی نے اپنی معرکہ آرا کتاب "دی ایکس پین شن آوف انگلینڈ" میں نہایت محققانہ بحث کے بعد بتایا ہے کہ انگریزی قبضۂ ہند کو "فتح" سے تعبیر کرنا درست نہیں، درحقیقت اسے خود اہل ہند کے ایک اندرونی ملکی انقلاب کا نتیجہ سمجھنا چاہئے یا کہنا چاہئے کہ ہند کو خود اہل ہند نے (انگریزوں کے لئے) فتح کیا کیونکہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کو انگلستان سے کوئی بڑی فوج لانی پڑی نہ روپیہ۔ بلکہ ایک عام بدنظمی اور انتشار کے زمانے میں جب کہ کہیں کوئی والی اور کہیں کوئی فوجی سردار محض اپنی ذاتی سعی اور شخصی اغراض کے لئے حکومت و ریاست حاصل کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا، پہلے فرانسیسی اور پھر انگریز تاجر بھی اس دوڑ میں شریک ہو گئے اور کسی باجی راؤ یا کسی حیدر علی کی طرح انھوں نے بھی یہیں کے اجیر سپاہیوں کی مدد سے اپنے ملکی مقاصد میں کامیابی حاصل کر لی۔ بلکہ کمپنی کا ان افراد کے مقابلے میں ایسی کامیابی

باب ۶

حاصل کرلینا کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ وہ کم سے کم ایک متحد جماعت تھی اور بوقت ضرورت اپنے ملک (انگلستان) سے بھی کچھ نہ کچھ امداد حاصل کر لیتی تھی[۱]۔ الغرض اگرچہ ہندوستان کے اندرونی خلفشار اور حکمران طبقے کی نااہلی سے کمپنی نے فائدہ اٹھایا لیکن اس کو جو کامیابی ہوئی وہ بہت کچھ اہل ہند ہی کی مدد سے ہوئی تھی اور بعد میں جس قدر نظم ونسق کا کام بڑھتا گیا اسی قدر کمپنی کے ہندوستانی ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ پھر جب یہ ملازمین اپنی قابلیت اور سرکار انگریزی کی خیر خواہی کے صلے میں "سول سروس" اور انگریزی عدالتوں کے ممتاز عہدوں تک ترقی کرنے لگے تو عام ہندوستانی رعایا کی مجموعی قدر و منزلت بھی انگریزی حکام کی نظر میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔

ابتدائی مجالس وضع قوانین

ایک مدت تک سب سے اعلیٰ انتظام یا فوجی عہدوں تک اہل ہند کی رسائی نہ تھی۔ اور نہ وہ حکومت عالیہ کی ان مجلسوں میں شریک کئے جاتے تھے جو وائسرائے کو ملکی انتظام یا وضع قوانین کے کام میں امداد و مشورہ دینے کے واسطے بنائی گئی تھیں۔ مگر مغربی آئین سے واقفیت اور انگریزی تعلیم کے اثر سے اہل ہند میں اپنے سیاسی حقوق کا احساس پیدا ہو چلا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۱ء میں "قانون مجالس ہند" کے نام سے ایک قانون نافذ کیا گیا جس کی رو سے چند ضروری تبدیلیاں کی گئیں۔ وائسرائے کی مجلس عاملہ میں پانچ معمولی اراکین شامل کئے گئے جن کا کام عاملانہ ہوتا تھا لیکن وضع قوانین کے اغراض کے لئے چند اراکین اور اضافہ کئے گئے جن کو وائسرائے نامزد کرتا تھا جن میں آدھے اراکین کا غیر سرکاری ہونا ضروری تھا۔ ان اراکین کی تعداد ۱۲ سے زیادہ اور ۶ سے کم نہیں ہوتی تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ صرف وضع قانون میں حصہ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اس قانون کی رو سے صوبوں میں بھی قانون سازی کے لئے علیحدہ مجلسیں بنائی گئیں اور اس کا اختیار وائسرائے کو دیا گیا۔ صوبہ واری مجالس کے متعلق یہ قاعدہ بنایا گیا کہ ان کے اراکین میں ایک تہائی غیر سرکاری لوگ ہوں۔ لیکن اس انتظام سے کوئی زیادہ فائدہ اور تشفی نہیں ہوئی کیونکہ ان مرکزی اور صوبہ واری مجلسوں کے اراکین کی تعداد اور اختیارات بہت غیر وقیع تھے اور خود وائسرائے اراکین نامزد کرتا تھا اور قومی کانگریس نے جس کے

۱۔ سیلی کی محولہ کتاب کے حصہ دوم میں زیادہ تر "ہندوستان" ہی کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے اور خاص کر دوسرا اور تیسرا باب (زیادہ درس) "پڑھنے کے لائق ہے مذکورۂ بالا اقوال و آرا کے لئے دیکھو صفحات ۲۰۸ تا ۲۱۱ و ۲۲۸ و ۲۲۷ وغیرہ وغیرہ۔

۱۸۸۵ء سے اجلاس ہونے لگے تھے معقول مطالبات پیش کر دیے جن کو حکومت نے خوب محسوس کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۲ء میں ایک اور قانون مجالس ہند پاس کیا گیا جس کی رو سے اور اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ اوّل تو مرکزی اور صوبہ واری مجالس کا حجم بڑھایا گیا۔ وائسرائے کی مجلس کے اراکین کی تعداد ۱۲ سے ۱۶ تک کر دی گئی اور مدراس اور بمبئی کی مجالس کی تعداد بیس۲۰۔ دوسری اہم تبدیلی یہ تھی کہ ان مجالس میں انتخاب اور نمایندگی کی ایک ہلکی شان پیدا کی گئی۔ یعنی مرکزی مجلس میں مختلف طبقات اور صوبوں کی مجالس سے نمایندے بلائے جانے لگے اور صوبوں میں بلدیات۔ جامعات اور ایوان تجارت سے اراکین نامزد کئے جاتے تھے۔ نیز ان مجالس کو خاص شرائط کے ساتھ سالانہ موازنہ پر بحث کرنے کا اختیار دیا گیا۔

منٹو مارلے اصلاح

اول تو قانون مجالس کی تبدیلیوں سے زیادہ تشفی نہیں ہوئی دوسرے بیسویں صدی کے اوائل سے حالات بہت بدلنے لگے۔ ۱۹۰۴ء میں جنگ روس وجاپان میں جاپانیوں نے روسیوں کو شکست فاش دیدی اور اس سے ایشیا کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی بھی اس سے ضرور متاثر تھے اس کے علاوہ اس زمانے میں انگلستان کی پارلیمنٹ میں ایک آزاد خیال فریق غالب ہوگیا جس کو ہندوستان سے زیادہ ہمدردی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کے جذبات زیادہ تیز ہو گئے۔ تقسیم بنگالہ کے خلاف پہلے سے ہیجان برپا تھا اور یہ اور زیادہ شدید ہوگیا۔ ۱۹۰۸ء میں انگریز دن بدن برگشتہ ہوگئے اور اس کے انسداد کے لئے وزیر ہند کو کئی قوانین بنانے پڑے تھے۔ لیکن ساتھ ہی حکومت یہ محسوس کرنے لگی کہ حکومت ہند میں اور اصلاح ہونی چاہئے تاکہ اس میں اہل ہند بھی شریک ہوسکیں۔ اس زمانے میں لارڈ مارلے وزیر ہند تھے۔ لارڈ منٹو کے مشورے کے ساتھ جو اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے وہ آئینی اصلاحات نافذ کیں جو منٹو مارلے اصلاحات ۱۹۰۹ء کے نام سے مشہور ہیں ۱۹۱۲ء میں ان کی نظر ثانی بھی ہوئی اس کی رو سے گورنر جنرل کی مجلس وضع قوانین میں ۶۹ اراکین کر دیے گئے۔ منجملہ ان کے ۳۳ نامزدہ اور ۲۷ منتخب ہوتے تھے۔ اور انتخاب عام نہیں بلکہ مختلف جماعتوں کی طرف سے ہوتا تھا۔ اور ۹ اراکین بربنائے عہدہ شریک ہوتے تھے۔ صوبوں کی مجالس میں بھی تعداد تقریباً دگنی کر دی گئی۔ بڑے صوبوں کی انتہائی تعداد ۵۰ اور چھوٹے صوبوں کی ۳۰ کی گئی۔ نیز ان مجلسوں کو موازنے پر بحث کرنے کا پہلے سے زیادہ اختیار دیا گیا

اور عام معاملات سے متعلق یہ اپنی قرار دادیں بھی پیش کرنے لگے۔ مگر ان آئین و اختیارات کا حال پڑھتے وقت ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان کی یہ انگریزی حکومت بجائے خود مختار نہیں ہے بلکہ حکومت انگلستان کے ماتحت ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ اقتدار میں پارلیمنٹ جس طرح وقتاً فوقتاً ہندوستان کے معاملات میں دخل دیتی رہی تھی اس کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ یہ دخل رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد کمپنی کا اقتدار بالکل اٹھ گیا اور اس وقت سے ہندوستان براہ راست انگلستان کی پارلیمنٹ کا محکوم بن گیا۔ مجلس نظارت کو برخاست کر کے ایک مجلس ہند بنائی گئی اور اس کا صدر وزیر ہند ہوگیا جو پارلیمنٹ کے سامنے ہندوستان کے جملہ امور کا ذمہ دار ہے۔ پارلیمنٹ اسی وزیر کے مشورے سے ہندوستان کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا تقرر کرتی ہے اور آئین وقوانین کا نفاذ کرتی ہے۔ منٹو مارلے اصلاح کی رو سے مجلس ہند میں ایک ہندوستانی بھی شریک کیا گیا۔

جنگ عظیم کی وجہ سے جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہوئی اور چار سال تک جاری رہی تمام دنیا کے حالات بدل گئے اور ہندوستان پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس جنگ میں خود اہل ہند نے جان و مال سے حصہ لیا تھا اور اس کے صلے میں وہ اپنے مطالبات پیش کرنے لگے۔ دوسری طرف برطانیہ کے مدبروں نے جنگ عظیم کے جو مقاصد اور آئندہ اصلاحات کے متعلق جس قسم کے ارادے ظاہر کئے تھے ان سے سیاسی آزادی کا جوش بہت بڑھ گیا۔ کانگریس نے آزاد حکومت کا مطالبہ کر دیا اور مغربی ممالک کی طرز پر ایسے ملک میں بھی ایک ایسی جمہوری حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے جس کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کا کوئی دخل نہ ہو۔ مسلمان جو بہت دن تک کانگریس سے علیحدہ بلکہ اس کے مخالف رہے تھے رفتہ رفتہ اس مطالبے میں کانگریس کے ہم آواز ہو گئے کہ ہندوستان کو اس قسم کی حکومت خود اختیاری ملنی چاہیئے جیسی انگلستان کے قلمرو ں کو یعنی کنیڈا آسٹریلیا وغیرہ کو حاصل ہے۔ انگلستان کے ارباب سیاست نے بھی اس کو محسوس کیا کہ ان حالات میں منٹو مارلے اصلاح بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ مسٹر مانٹیگو نے جو بڑے فراخ حوصلہ وزیر ہند تھے ۱۹۱۷ء میں یہ اعلان کیا کہ انگلستان کا مسلک یہ ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق میں ہندوستانیوں کا اشتراک عمل حاصل کرے اور بتدریج ذمہ دار حکومت کا انتظام کرے۔ اس اعلان کے بعد ہی مسٹر مانٹیگو لارڈ چیمز فرڈ وائسرائے ہند سے گفتگو کرنے کے لئے ہندوستان آگئے۔ ان کی تجویزیں

ایک رپورٹ کی شکل میں شائع ہوگئیں اور یہ ۱۹۱۹ء میں قانون کی شکل میں پاس ہوگئیں جو "مانٹیگو جیمز فرڈ" اصلاحات کہلاتی ہیں۔

مانٹیگو جیمز فرڈ اصلاحات

اس جدید قانون کی رو سے وزیر ہند اور مجلس ہند کے اختیارات اور ساخت میں خفیف تبدیلیاں کی گئیں اور ایک جدید عہدہ ہائی کمشنر ہند کے نام سے مقرر کیا گیا جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے لئے ضروری ذخائر خریدنے کا انتظام کرتا ہے۔ ہندوستان کی اندرونی حکومت میں بہت تبدیلیاں ہوئیں اول تو مرکزی اور مقامی امور الگ کر دیے گئے۔ ایسے امور جن کی مرکزی شان ہوتی ہے جیسے فوج۔ ریل۔ ٹپہ۔ سکہ اور دیسی ریاستوں کی نگرانی وغیرہ وہ مرکزی حکومت کے سپرد کر دیے گئے۔ ان امور کا انتظام ایک وائسرائے اور ان کی مجلس عاملہ کرتی ہے جس کے سات اراکین ہوتے ہیں اور دوسرے قانون سازی کے لئے بجائے ایک کے دو مجلسیں بنائی گئیں۔ ایک مجلس کو مجلس مملکت کہتے ہیں جس میں (۶۰) اراکین ہوتے ہیں منجملہ ان کے بعض سرکاری عہدہ دار ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر منتخب اراکین ہوتے ہیں۔ دوسری "مجلس وضع قوانین" ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ سو اراکین ہیں اور منجملہ ان کے سو سے زیادہ منتخب اراکین ہیں۔ اور یہ سب منتخب اراکین مجلس مملکت کے اراکین کی طرح عام رائے دہی سے منتخب ہوتے ہیں جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوتے تھے۔

دوسرے امور جن کی شان بالکل مقامی ہے۔ جیسے تعلیم۔ کوتوالی۔ زراعت۔ آبرسانی وغیرہ سب صوبوں کے سپرد کر دیے تاکہ صوبوں کی حکومت خود اپنے صوابدید سے ان کا انتظام کرے اور مرکزی حکومت ان میں بہت کم دخل دیے لیکن ان امور کے بھی دو حصے کر دیے گئے۔ ان میں بعض امور ایسے ہیں جیسے کوتوالی عدل گستری وغیرہ ان کی خاص اہمیت ہے۔ ان کو امور مخصوصہ کا نام دیا گیا اور ان کا انتظام صوبوں کے گورنر اور ان کی مجلس عاملہ کرتی تھی جس کے دو یا تین اراکین ہوتے تھے جن کا تقرر براہ راست انگلستان سے ہوتا تھا اس کے برخلاف تعلیم زراعت آبرسانی وغیرہ ایسے امور ہیں جن کی کم اہمیت ہے اس لئے ان کو امور مفوضہ کا نام دیکر ہندوستانی وزرا کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ وزرا صوبوں کی مجالس قانون ساز کے اراکین ہوتے ہیں اور اس طریقے سے ان وزرا کو اپنے مجالس کی خوشنودی حاصل کرنی پڑتی ہے اور ذمہ داری پوری کرنی پڑتی ہے خود صوبہ واری مجالس کی توسیع بھی کر دی گئی جس کے اکثر اراکین منتخب ہوتے ہیں۔ اس انتظام کو

"دو عملی" کہتے ہیں۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات مانٹفرڈ جن کا اوپر خاکہ کھینچا گیا کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ صوبوں کی دو عملی اسقدر بے ڈھنگی چیز تھی کہ وہ کبھی خوش اسلوبی سے نہیں چلی۔ چنانچہ بنگالہ اور صوبۂ متوسط میں بالآخر اس قانون کو معلق کرنا پڑا جب سے اس قانون کا نفاذ ہوا تھا ملک کی بے چینی برابر بڑھتی گئی جس طرح اوپر ذکر ہوا کھدر کی تحریک اور اس کے بعد ترک موالات کی ڈراؤنی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اگرچہ لارڈ ریڈنگ نے اپنی حکمت عملی سے ان کے سدباب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے جانشیں لارڈ ارون کے عہد میں اس سے زیادہ تشویشناک تحریکیں پیدا ہوگئیں جو ستیاگرہ اور سول نافرمانی کے نام سے موسوم ہیں ان بیچینیوں کو دیکھکر خود حکومت نے دستور میں تبدیلی کرنا ضروری سمجھا۔ سر مڈی من کے زیر صدارت ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کے چند اراکین نے جن میں سپرو و جناح تھے اس بات پر زور دیا کہ دستور کی از سر نو تجدید ہونی چاہئے۔ کچھ اس وجہ سے حکومت نے ۱۹۲۷ء میں سیمن کمیشن بٹھائی جس نے ہندوستان کے حالات پر غور کرکے ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ تیار کی اور اس میں یہ تجویزیں پیش کیں کہ صوبوں میں تو کامل ذمہ دار حکومت ہونی چاہئے۔ وسیع حق رائے دہی کے ساتھ قانون ساز جماعتیں اس طرح مرتب کی جائیں کہ ان میں سرکاری عہدہ دار شریک نہ ہوں۔ مرکز میں برطانوی اقتدار جوں کا توں قائم رہے۔ لیکن ان کی بڑی سفارش یہ تھی کہ ہندوستان کا دستور وفاقی ہونا چاہئے جس میں دیسی ریاستیں بھی شامل ہوں۔ چونکہ کمیشن نے وفاق کا پورا خاکہ تیار نہیں کیا تھا اس لئے انگلستان میں گول میز کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ ان کانفرنسوں کے ۱۹۳۰ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک تین اجلاس ہوئے۔ بعض روسائے ہند نے بھی اس میں شرکت کی اور شرکت وفاق کے لئے رضامندی ظاہر کی۔ جب کانفرنسوں میں یہ تجویزیں مرتب ہوگئیں تو ان کو ۱۹۳۳ء میں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا جس کو کاغذ ابیض کہتے ہیں، اور پارلیمنٹ نے ان کو مزید جانچ پڑتال کے لئے پارلیمنٹ کی مشترک کمیٹی کے سپرد کردیا جس میں دارالامرا اور دارالعوام دونوں کے اراکین شریک تھے۔ لارڈ لنلتھگو اس کے صدر نشین تھے۔ اس کمیٹی نے بھی ضروری تجویزیں اور ترمیمیں کیں جو ایک رپورٹ کی شکل میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئیں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں ۱۹۳۵ء میں "قانون حکومت ہند" پاس کیا گیا۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کی رو سے ہندوستان کے لئے جو دستور ترتیب دیا گیا ہے اس کی وفاقی شکل ہے۔ اس میں مرکزی اور صوبہ واری اختیارات کی تقسیم کردی گئی ہے۔ صوبوں کے ساتھ دیسی ریاستیں بھی وفاق میں شریک رہیں گی۔ چونکہ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے اور جگہ جگہ یہاں مختلف قومی اور جغرافی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اس لئے ملک کی تمامتر حکومت کی باگ مرکز کے سپرد کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس طریقۂ حکومت سے ہر جگہ اور ہر صوبے میں ایک ہی طرح کی حکومت ہوگی اور اس سے ملک کی صحت بخش ترقی نہیں ہو سکتی۔ جس ملک میں جغرافی اور قومی اختلافات زیادہ پائے جائیں وہاں وفاقی حکومت زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ اس انتظام میں مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے اختیارات کی تقسیم کردی جاتی ہے۔ مرکزی حکومت صرف ایسے کام انجام دیتی ہے جو سب ملک کے لئے مشترک ہوتے ہیں جیسے خارجی مسائل۔ فوج کا انتظام سکہ و ٹپہ وغیرہ ان کے علاوہ دوسرے امور جیسے زراعت۔ تعلیم۔ حفظان صحت وغیرہ جن کی مقامی نوعیت ہے سب صوبوں کے سپرد کردے جاتے ہیں تاکہ وہ مقامی ضرورت کے مطابق ان کا انصرام کریں مثال کے طور پر بنگالے کے خاص حالات کا لحاظ کرکے جس تعلیم و نصاب کی ضرورت ہے وہ گجرات کے لئے نہیں ہے۔ صوبۂ متوسط کے لئے جس حفظان صحت کی ضرورت ہے وہ پنجاب کے لئے نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے صوبوں کا حال ہے۔ ہر جگہ کی صورتیں مختلف ہیں ان اختلافات کا لحاظ کرتے ہر جگہ کا علیحدہ انتظام ہونا چاہئے ہر صوبے کی حکومت اس کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ ان چیزوں میں مرکزی حکومت کی دخل اندازی مناسب نہیں ہوگی مرکزی حکومت کا صوبے کے ہر معاملے میں دخل دینا جیسے اس قانون ہند کے نفاذ سے پہلے ہوتا تھا ملک کی ترقی کے منافی ہے

وفاقی حکومت

مرکزی حکومت میں وفاقی امور کی انجام دہی کے لئے حسب سابق ایک گورنر جنرل رہیں گے۔ اگرچہ مرکزی امور اکثر و بیشتر قانون ساز مجالس کے سپرد کر دئے گئے ہیں تاہم بعض مخصوص امور بہ لحاظ اہمیت ایسے بھی ہیں جو صرف گورنر جنرل کی صوابدید پر منحصر ہیں جیسے۔ فوج۔ امور مذہبی اور امور خارجہ اور قبائلی علاقے۔ ان کی سربراہی چند کونسلروں کی مدد سے ہوا کرے گی جن کو خود گورنر جنرل مقرر کریں گے۔ باقی امور کی انجام دہی کے لئے قانون ساز مجلسوں کے ایسے اراکین مقرر ہوں گے جن کو خود مجلسیں چاہتی ہوں اور یہ لوگ وزرا کہلائیں گے

اگرچہ یہ وزرا اپنی مجلس کی خوشنودی کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں ذی اختیار ہیں تاہم امن و امان اور چھوٹے طبقوں کے حقوق کے لئے گورنر جنرل کو بہت کچھ اختیارات حاصل ہیں اور ناگہانی خطرات کو روکنے کے لئے وہ جب چاہیں وزرا کے معاملات میں مداخلت کر سکتے ہیں۔ قانون سازی کے لئے دو مجلسیں تجویز ہوئی ہیں جیسے اس وقت ہیں ایک مجلس مملکت اور دوسری مجلس وفاقی۔ لیکن بہ نسبت پہلے کے ان کی ترکیب اور اختیارات میں بہت فرق کر دیا گیا ہے۔ مجلس مملکت میں برطانوی ہند کے ۱۵۶ نمایندے اور دیسی ریاستوں کے زیادہ سے زیادہ ۱۰۴ نمایندے ہوں گے اور وفاقی مجلس میں برطانوی ہند کے ۲۵۰ اور دیسی ریاستوں کے ۱۲۵ نمایندے شریک رہیں گے۔ گورنر جنرل کے مخصوص اختیارات کے قطع نظر ان مجلسوں کو قانون سازی کے بہت کچھ اختیارات حاصل رہیں گے اور وزرا اپنی مجالس کی خوشنودی سے کام کریں گے۔

صوبوں میں پچھلی دوعملی غائب کر کے پوری حکومت خود اختیاری دی گئی ہے تاکہ یہ اپنے متعلقہ صوبہ واری امور میں پورے اختیار سے کام کریں۔ اگرچہ صوبوں کے گورنر کو چند مخصوص اختیارات بھی حاصل ہیں جو ناگہانی صورتوں میں استعمال کر سکتے ہیں لیکن ان اختیارات کے قطع نظر جو گاہے ماہے استعمال ہوں گے صوبوں کے جملہ امور وزرا کے ہاتھ میں ہوں گے جو قانون ساز مجلسوں سے مقرر ہوں گے۔ جن صوبوں پر اس قانون حکومت ہند کا اطلاق ہوتا ہے وہ ۱۱ ہیں۔ بنگالہ۔ بمبئی۔ مدراس۔ صوبۂ متحدہ۔ بہار۔ آسام پنجاب۔ صوبۂ متوسط۔ صوبۂ سرحدی۔ سندھ۔ اڑلیسہ۔ صوبۂ سرحدی ۱۹۳۲ء میں بڑا صوبہ بنا یا گیا۔ اور آخری دو صوبے سندھ اور اڑلیسہ کو ۱۹۳۵ء کے قانون کی رو سے بڑے صوبے بنائے گئے اور برما جو پہلے ہندوستان کا ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ خارج کر دیا گیا ہے۔ اول الذکر چھ صوبوں میں مقننہ کے دو ایوان ہیں۔ باقی پانچ صوبوں میں صرف ایک۔ اور اراکین کی تعداد بہ لحاظ آبادی ہر جگہ مختلف ہے۔ ان مجلسوں کو اپنے صوبہ واری امور میں پورا اختیار ہے۔ وزرا انھیں مجلسوں کے اراکین ہوتے ہیں اور انھیں کی خوشنودی سے کام کرتے ہیں۔ اور گورنروں کو سوائے ناگہانی مواقع کے وزرا کے کام میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔ غیر ضروری دخل اندازی کی صورت میں وزرا استعفاء دے دیتے ہیں اس کے علاوہ دستور کی حفاظت کے لئے کہ ہر حکومت اپنی جگہ کام کرے ایک وفاقی عدالت بھی

قائم کر دی گئی ہے۔ اس کا کام دستوری اختلافات کا تصفیہ کرنا ہے۔

یہ قانون ۱۹۳۵ء میں پاس تو ہو گیا لیکن اس کا فوری نفاذ نہیں ہو سکا۔ کیونکہ اس کے بعض اجزا ایسے ہیں جو خاص شرائط کے تابع ہیں۔ مثلاً وفاق کا نفاذ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ تمام ریاستوں کی آدھی آبادی شرکت وفاق کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اور مرکزی مقننہ میں ریاستوں کے نمایندے شریک ہوں۔ اور جب تک وفاق کا انتظام نہ ہو جائے مرکزی ذمہ داری نہیں پیدا ہو سکتی۔ البتہ ۱۹۳۷ء پہلی اپریل سے صوبوں میں جدید حکومت قائم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۱ صوبوں میں قانون کے منشا کے مطابق وزارتیں کام کر رہی ہیں۔

تمت

صحت نامہ

تاریخ ہند جلد چہارم

(برائے انٹرمیڈیٹ) "طبع دوم"

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۲۱	۱۹	ہری ہنت پچھر کے ماتحت۔	ہری ہنت پھر کے کے ماتحت۔
۳۷	۱۸	زن	زین
۴۱	حاشیہ سطر ۵	وہ سال	وہ سال
۴۳	۹	دن مسیحی	دینِ مسیحی
۴۶	۸	چھوٹی سی پہاڑی پر	چھوٹی سی پہاڑی ریاست پر۔
۴۷	۱	یہ تو کام	تو یہ کام
۵۰	۲۰	بنداروں	پنڈاروں
۵۲	۲۰	منتظم قوت	منظم قوت
〃	۲۱	مطابق سنہ ۱۲۳۲ء	مطابق سنہ ۱۲۳۲ھ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۵۴	۱ و ۴	ہیسٹنگر	ہیسٹنگز
۵۵	۸	اسی مقصد	اصلی مقصد
〃	۱۸	کاشتکا	کاشتکار
۵۷	۱۰	ہمیں	یہاں
〃	۱۲	مطابق سنہ ۱۲۳۵ء	مطابق سنہ ۱۲۳۵ھ
۵۸	۳	مطابق سنہ ۱۲۲۹ء	مطابق سنہ ۱۲۲۹ھ
۵۹	۴	(سنہ ۱۲۴۳ء)	(سنہ ۱۲۴۳ھ)
۶۶	۱۸	ناکہ	تاکہ
۶۷	حاشیہ سطر ۳	پریزیڈنٹ	ریزیڈنٹ
۷۰	۱۲ و ۱۵	میک نارٹن	میک ناٹن
۷۴	۶	شرفا ہیں۔	شرفا میں تھا۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۸۶	۴	زخ کیا	رُخ کیا
۹۱	۸	اورشہر	اوراس شہر
۹۳	۱۹	دست پرور	دست پروردہ
۱۱۴	۱۰	بارا ور	بارآور
"	۲۲	لے بنیاد	بے بنیاد
۱۱۵	۴	بکہ	بلکہ
"	۲۰	بڈھنگی	بے ڈھنگی
۱۱۶	۱۲	کیا	گیا
۱۱۸	عنوان حاشیہ	لارڈ ہارڈ نگ	لارڈ ہارڈنگ
۱۲۳	۴	ملابا	ملابار
۱۲۴	۸ و ۹	لارڈ ڈیڈنگ	لارڈ ریڈنگ
۱۳۴	۶	ہمولٹنوں	ہمو لٹنوں
۱۳۸	۱۰	رجحاں	رجحان
۱۴۱	۳	مجالسن	مجالس
۱۴۲	۲۴	تبندریج	بتدریج
۱۴۳	۲۳	نام ویگر	نام دیگر
۱۴۵	۱۱	جن گی ما	جن کی
"	۱۲	کر دلے	کر دیے
"	۲۱	کر د گئے	کر دیے گئے
.	.	.	.